نقش دگر

مسعود احمد چودھری: شخصیت وکارنامہ

مغرب ز تو بیگانہ مشرق ہمہ افسانہ
وقت است کہ در عالم نقش دگر انگیزی

علامہ اقبال

نقش دگر

مسعود احمد چودھری: شخصیت وکارنامہ

عبدالغنی جاگل

نقش دگر (مسعود احمد چودھری: شخصیت وکارنامہ)

مصنف: عبدالغنی جاگل

موسمِ اشاعت: جنوری ۲۰۱۸ء

تعداد: ۵۰۰

قیمت: ۳۰۰ روپے

زیرِ اہتمام: تفہیم پبلی کیشنز، راجوری (جموں کشمیر)

* ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی
* ایجوکیشنل بُک ہاؤس، علی گڑھ
* بُک کارنر، جہلم (پاکستان)
* تفہیم پبلی کیشنز، راجوری (جموں کشمیر)

فہرست ابواب کتاب

حصہ اول

باب اول : پیر پنچال کے گھٹتے بڑھتے سائے میں

باب دوئم : خطہ پیر پنچال کی غیر معمولی اور متضاد شخصیتیں

باب سوئم : گوجروں کا مختصر تاریخی پس منظر

باب چہارم : ملکی و قومی بعض قابل تقلید، نامور و مشہور شخصیات سر سید، ڈاکٹر ذاکر حسین اور ریاست بعض ادبی و سماجی و اصلاحی شخصیات، ڈاکٹر آغا اشرف علی، محمد یوسف ٹینگ، نعیم اختر اندرابی، فیض، عباس پور سے علی گڑھ تک کا تعلیمی سفر، سرشت میں طبقاتی رنگ کی آمیزش، گوجری زبان کے احیا کی کاوشیں، پولیس میں منفرد کارکردگیاں، شیر کشمیر پولیس اکادمی کا قیام، شکل و شمائل، سیاسی اثر و رسوخ، علم پروری اور کتاب دوستی، سر سید اور داکٹر ذاکر حسین کے اثرات، جشن فیض اور سیویل سوسائٹی کا قیام۔

معاصر شخصیات و حلقہء احباب: آغا اشرف علی، نعیم اختر اندرابی، اور محمد یوسف ٹینگ

باب پنجم : بابا غلام شاہ بادشاہ یونیورسٹی کا قیام

ماحولیات کا تحفظ، یونیورسٹی وژن، نظریات و فرمودات، ڈی لٹ ڈگری کا اوارڈ، سر راس اور مسعود چودھری موازنہ

باب ششم : گوجر تشخص کے مسائل اور قیام ٹرسٹ

افتتاحی تقریر، آواز گوجر، تقاریر، ریویو اور سیاسی اکابرین پیغامات

باب ہفتم : مسعود چودھری بعض معاصرین حضرات کی نظر میں

تبصرہ جات و تاثرات: ڈاکٹر صابر آفاقی پروفیسر قدوس، پروفیسر کفیل احمد قاسمی، خالد حسین، ڈاکٹر جاوید راہی، ڈاکٹر بشارت حسین انقلابی، محمد اسلم قریشی، چودھری علی حسین ہکلا، پروفیسر اے کے کول، پروفیسر دوست احمد، چودھری شوکت جاوید، چودھری شوکت پرویز اور ڈاکٹر صابر آفاقی۔

پیش لفظ

بسمہ تعالی، اس کتاب یعنی "غبارِ کارواں" کا مرکز و محور، خطہ پیر پنجال کے مخصوص طبقہ گوجر و بکروال سے تعلق رکھنے والی ایک اہم شخصیت مسعود احمد چوہدری اور ان کی خدمات کا احاطہ کرنا ہے۔ سماج کی ساخت، موضوع کی نزاکت اور تحریر کے مقاصد کو دھیان میں رکھتے ہوئے میں نے چند ابواب قائم کئے ہیں۔ اور ان سے پہلے کی بعض شخصیات اور انکے کوائف کا اجمالی خاکہ بھی پیش کیا ہے۔ کیونکہ ہمارے اس معجون مرکب جیسے سماج کے دوسرے طبقوں افراد کو یکسر فراموش نہیں کیا البتہ میں نے کہیں تفصیل کے بجائے اجمال و اختصار سے بھی کام لیا ہے۔

مسعود احمد چوہدری نے سر سید احمد خان اور ڈاکٹر ذاکر حسین کے نقوش پر چلتے ہوئے بابا غلام شاہ بادشاہ یونیورسٹی اور گورجر دیش چیریٹ ایبل ٹرسٹ کو پایہء تکمیل تک پہنچایا۔ انکے علاوہ کئی اور نامور اور مخیر حضرات نے خطہ پیر پنجال میں کچھ تعلیمی ادارے بھی قائم کئے ہیں۔ ان تمامتر کوششوں کے باوجود ابھی تک ہمارے سماج کے بیشتر گوشوں تک جدید علم و آگہی کی بھرپور روشنی نہ پہنچ سکی ہے۔ میرا ماننا ہے کمزور افراد کے لڑکوں اور لڑکیوں کی تعلیم و تربیت کے لئے ابھی مزید بہت کچھ کرنے کی ضرورت ہے۔ اور غیر سرکاری اداروں سے بہت سے امیدیں وابستہ ہیں۔ ممکن ہے میری یہ کاوش آنیوالے نسلوں کے کسی کام آسکے۔ میں نے اپنی تحقیق کے دوران علاقائی حالات و واقعات کا تزکرہ کیا ہے اور کہیں کچھ تجزئے بھی کئے ہیں۔ عزم راسخ و صدقِ نیت جیسے مہربان دوستوں یا پھر شوق و ذوق نے مجھے کہاں تک مستعد رکھا ہے۔

مسعود احمد چوہدری کیے احوال اور خدمات کا جائزہ لینے کی ایک بے لوث کاوش کی گئی ہے۔ اس سلسلہ میں اپنی نوعیت کی یہ پہلی کتاب ہے۔ اس تحقیق میں مجھے کم از دو سال لگے۔ مسعود چوہدری صاحب سے کئی ملاقاتیں بھی کیں۔ حالات و واقعات کی روشنی میں کتاب کو مکمل کیا ہے۔ زیر نظر کتاب کے آخر میں میں بعض معاصرین کیے مضامین بھی شامل کر دئے ہیں۔ اسطرح مسعود چوہدری کے حالات و خدمات پر یہ دستاویز آپکی خدمت میں پیش کی جاتی ہے۔ اگر یہ کتاب اگر سوانحی حیثیت رکھتی ہے مگر میں گوجر قوم کی زبوں حالی پر تاریخی حقائق کو بھی سامنے لانے کی کوشش کی ہے۔

عبدالغنی جاگل

باب اول:

پیر پنچال کے گھٹتے بڑھتے سائے میں

ذرہ ذرہ ہے مرے کشمیر کا مہماں نواز
راہ میں پتھر کے ٹکڑوں نے دیا پانی مجھے
(چکبست لکھنوی)

پیر پنچال پہاڑوں کا سلسلہ درون ہمالہ میں ہماچل سے لے کر راولپنڈی تک پھیلا ہوا ہے۔ یہی عظیم قدرتی حصار ہے جو کہ وادی کشمیر کو میدانی علاقوں سے الگ کرتا ہے۔ جنوب مغرب کی طرف کشمیر کے لئے پیر پنچال پہاڑوں کا سلسلہ بھی دراصل سد اسکندری کی حیثیت رکھتا ہے۔ شمال مغرب کی طرف سے آنے والے حملہ آوروں کو کشمیر پر حملہ کرنے کے لئے پونچھ راجوری اور اوڑی کے راستے ہی آنا پڑتا تھا۔ اور یہاں پہنچ کر راجاوں کو اعتماد میں لئے بغیر یا شکست دئے بغیر آگے بڑھنا ممکن نہ تھا۔ یہی وجہہ تھی کشمیر اور ان علاقوں کے حکمرانوں کے خوشگوار تعلقات اور دیرینہ مراسم تھے ۔ یہاں پر جس تہذیب نے نشو و نما پایا وہ بھی مخلوط قسم کی تھی، یہاں پر بکرماجیت کے عہد کی طرز کے منادر مثلا رام کنڈ مینڈھر ،بڈھا امرناتھ وغیرہ مغلوں کی سرائیں ، سکھوں کے گردوارے ، ہندو راجپوتوں کے اکھاڑے وغیرہ ہیں ۔ یہاں کئی راج گدیاں قائم ہوئیں اور وقت کی ریگِ رواں کے ساتھ اڑ بھی گئیں ۔ پونچھ کا راجہ رستم خان راٹھور سب سے طاقت ور راجہ تھا۔ پونچھ کا تاریخی قلعہ اسی نے بنوایا تھا۔ راٹھوروں کے زوال پذیر ہونے اور ڈوگروں کے عروج سے پہلے، پونچھ پر

گوجر سانگھو راجہ نے بھی کچھ عرصہ راج کیا۔ اس کے زوال پذیر ہونے کے بعد آپ راجی کا دور شروع ہوا۔ جس علاقے میں جس قوم کا غلبہ تھا اسی نے اپنی بالادستی منوائی۔ سرنکوٹ اور مینڈھر کے بالائی علاقوں پر گورجر متصرف رہے۔ منڈی کے چوبیس گاوں پر کشمیری خواجگان کا تسلط رہا۔ علاقہ باغ کے ملحق کوہالہ وچکار کوڈھونڈ سرداروں نے بانٹ لیا ۔ باقی علاقے پر تیزیال ،ملدیال وغیرہ مقدم بن گئے۔ کہوٹہ دیگوار پر سدھرون کے چودھریوں نے قبضہ کر لیا۔ بقول محمد الدین فوق سابقہ پونچھ کے صدر مقام اور اردگرد کے نزدیک دیہاتوں پر "شمس خان ملدیال راجہ کا قبضہ تھا۔ غرض کہ ہر گاوں میں متعدد راجے اور ہر گھر میں

کئی خود ساختہ مقدم تھے ۔ لوٹ مار اور مار دھاڑ، ان قبائل کا معمول تھا۔ خانہ جنگیوں، فسادات اور باہمی آویزشوں میں انکی بسر اوقات تھی۔" شمس خان ملدیال چاہتا تھا کہ پونچھ میں اپنا راج قائم کرئے۔ سکھوں کے ایماء وحمایت کے ساتھ گلاب سنگھ نے شمس خان کو گرفتار کر کے تراڑ کھل کے مقام پر ایک منوں کے درخت کے نیچے ایک پتھر پر کھال اتار کر بے دردی سے قتل کر دیا۔ دراصل سدھرون کے راجواڑوں نے ہی شمس خان کو دھوکے سے قتل کروایا تھا۔ راجوری میں ۵۹۲ سال مسلسل ایک ہی خاندان جرال کی حکومت رہی۔ ان راجواڑوں کا خطاب سینھ تھا۔ مثلا نورالدین اپنے آپ کو نور سینھ کہلاتا تھا۔ بعد میں مغلوں سے رشتہ داری ہوئی تو انہیں میرزا خطاب ملا۔

پونچھ راجوری میں گوجر ،راجپوت کشمیری ، سید ، مغل، گکھڑ ، تھکیال، ڈومال، بگیال ، ڈلی، فیروزال ،برہمن ، کھشتری کئی قومیں آباد ہیں۔ گوجری اور کشمیری کے علاوہ یہاں پہاڑی بولی عام بولی جاتی ہے۔ میرے خیال میں پہاڑی، ڈوگری، سندھی اور پنجابی کا مرکّب معجون ہے۔ جب کہ گوجری راجستھانی کا کی ایک شاخ ہے۔

گوجر قبائل سخت جان افغانوں کی طرح شلوار قمیض اور پگڑی پہنتے ہیں اور گجر عورتوں کے لباس افغان عورتوں کی طرح قدرے چھوٹے اور کھلے ڈھلے ہوتے ہیں ۔ انکا لباس انہیں کام کاج میں رکاوٹ نہیں ڈالتا انکے زیورات چاندی کے ہوتے ہیں اور نمیاں قسم کے بڑے بڑے۔یہاں اور بھی کئی پہاڑی جفاکش قومیں رہتی ہیں جو محنت مزدوری اور کھیتی باڑی ، اور پالتو جانوروں سے حاصل ہونے والی چیزوں کی آمدنی سے زندگی گزارتے ہیں۔

قدرتی تقسیم کے لحاظ سے پونچھ جس کی سرحد ایک طرف راولپنڈی اور دوسری طرف سے وادی کشمیر سے ملتی ہے۔ مغربی علاقے میں ڈھونڈ اور سُدھن وغیرہ آباد ہیں۔ جو بڑے تنومند اور جفاکش ہیں یہ قبیلے جو کوہ مری کی تحصیل میں بھی آباد ہیں ۔ سپاہی پیشہ ہیں کیونکہ پونچھ کے مغربی حصے میں کھیتی باڑی کم ہی ہوتی ہے۔ہاں جنوبی اور مغربی حصہ کافی زرخیز ہے سدھنوں اور ڈھونڈوں کی بولی پہاڑی کی ہی ایک شاخ ہے ہاں اس میں سپاہیانہ اکھڑپن زیادہ ہے یہاں گوجری ۔اور کشمیری بولی بھی بولی جاتی ہے۔ مختلف حصوں کی آب وہوا میں خاصا فرق ہے۔یوں تو جنوبی اور مغربی علاقے کے بعض دیہاتی علاقوں کے سوا پونچھ بھر میں برف پڑتی ہے۔ لیکن جوں جوں مشرق اور شمال کی جانب

بڑھتے جاؤ تو ہوا زیادہ خنک ہوتی جاتی ہے اور لباس اور زبان رہنے سہنے کے طور طریقوں میں کشمیر کا اثر نمایاں نظر آتا ہے ۔ جنوب میں ڈلی قبیلہ کے لوگ کثرت سے ہیں۔ مشرقی اور شمالی علاقے میں زیادہ تر کشمیری اور گوجر آباد ہیں ۔پیداوار کا بھی یہی حال ہے۔ گرم سیر علاقے میں گیہوں اور چاول خوب ہوتا ہے سرد علاقے میں مکئی، راجماش ، آلو، شہد، آڑو، خوبانیاں، ناشپاتیاں، اخروٹ اور سیب پیدا کئے جاتے ہیں۔
بقول چراغ حسن حسرت: "اس علاقے کے سامنے بلند پیر پنجال کے سلسلہ کوہ کی لمبی فصیل کھینچی ہے جس کی چوٹیاں پندرا ہزار فٹ تک اونچی ہیں۔ تتا کٹی اس سلسلہ کی سب سے اونچی چوٹی ہے۔ان پہاڑوں کو چیر کر آگے بڑھو تو خطہء مینو سواد نظر آتا ہے جسے وادی کشمیر کہتے ہیں یہ اس عمارت کی دوسری منزل ہے اور پیر پنجال کا سلسلہ کوہ اس کا زینہ ہے۔"

خطہ پونچھ راجوری کا رقبہ لگ بھگ سولہ سو مربع میل ہے۔ یہ کشمیر کی جنوبی محاذ پر ہے۔ ۱۹۴۰ء کی آبادی کے اعداد وشمار کے مطابق یہاں ۹۵ فیصد مسلمان آبادی تھی تین فیصد ہندو اور دو فیصد سکھ تھے۔ پلندری، باغ، سدھنوتی وغیرہ علاقے مقبوضہ کشمیر کے پاس چلے جانے سے یہاں کا ڈیموگرافیکس قدرے بدل چکا ہے۔ مقامی راجاوں کے بعد سکھوں کے دور اقتدار میں موقع شناس ڈوگرے یہاں بلائے ناگہانی کی طرح مسلط ہوگئے۔ انہوں نے یہاں کے عوام کا خوب استحصال کیا۔

باب دوئم
خطہ پیر پنجال کی غیر معمولی ومتضاد تاریخی شخصیتیں

خطہ ءپیر پنجال بانہال درے سے شروع ہوتا ہے اور علاقہ راجوری پونچھ سے ہوتا ہوا مظفر آباد تک چلا جاتا ہے ۔ معتبر روایت کے مطابق اسے پانچال دیس بھی کہا جاتا تھا جس کے ڈانڈے مہابھارت کے زمانے سے ملتے ہیں۔ یہاں کئی تہذیبوں کے نقوش اب بھی دستبرد زمانی سے بچ بچا کر دعوت نظارہ دے رہے ہیں۔ یہاں کئی متحرک اور فعال ہستیاں پیدا ہوئیں۔چند شخصیات کے مختصر احوال بطور مثال پیش کئے جاتے ہیں۔

آبلہ پا ہوں مگر وسعت صحرا کی قسم
عزم محکم نے پہاڑوں کا جگر چیر دیا

حضرت باباغلام شاہ بادشاہ

علاقے اپنی زمین کے لئے ہی مشہور نہیں ہوئے ۔پیداواریں اور معدنیات بھی علاقوں کے تشخص کی علامت نہیں ہوتی۔ بلکہ علاقوں کی شناخت اور پہچان کا سبب وہ شخصیتیں ہوتی ہیں جو اپنے کارناموں سے ، اپنے خون سے، اپنی روحانیت سے، ریاضت، بندگی اور بھگتی اور عشق سے علاقوں کو تشخص عطا کرتے ہیں۔ان ہی بزرگوں کی بدولت چھوٹی چھوٹی جگہیں تاریخ کے اوراق پر ابھرتی ہیں۔ان لوگوں کی حیات و ممات میں کوئی فرق نہیں ہوتا قدرت لوگوں کے دلوں میں انکی محبت پیدا کر دیتی ہے۔

اور انکے فیوض کا سلسلہ انکی ظاہری موت کے بعد بھی جاری رہتا ہے۔باباغلام شاہ بادشاہ ،سیدان کسران تحصیل گجر خان ضلع راولپنڈی کے رہنے والے تھے۔ اور امام بری لطیف کے مرید۔ مینڈر میں تکیہ کالابن کے میں کچھ عرصہ مقیم رہے۔اور بالائی کالابن کے لوگوں کے لئے دعا کی۔بزرگوں کی دعا بارش کی طرح ہوتی ہے۔جو کوہ و دمن ، بلند وپست پر بلا امتیاز یکساں برستی ہے۔لیکن زمینیں اپنی صلاحتیوں کے مطابق پیداوار فراہم کرتی ہیں۔

بقول لیاقت حسین خان انکے کچھ جملے اور کلمات نسل در نسل اب بھی زبان زد عوام ہیں۔

دھڑیاں پڑھیاں، اواہیاں منہ بائیاں
تارا کوٹئے رلّے، قصبے بے وصبے

یعنی محلہ دھڑا والے پڑھے لکھے ہوں گے تاراکوٹ والے دوغلے اور محلہ اواہاں والے لوگ زور آور اور زبان دراز۔ اور قصبہ والے بے وصف۔

وہ کئی جگہوں پر قیام کرتے ہوئے پہلے شاہستار ڈنا اور پھر لسانہ بمقام تکیہ چلے گئے۔لسانہ تکیہ پر قیام کے دوران انکے مرید خاص یحیٰی خان کو کسی نے قتل کر دیا۔وہ رنجیدہء خاطر ہو کر وہاں سے بٹوڑی درابہ چلے گئے اور پھر آخر کار وہاں سے شاہ درا جو کہ اس وقت سینہہ درا یعنی شیروں کی کچھار تھی۔ وہیں جابیٹھے۔

بارہ سو چھبیس ۱۲۲۶ء سن ہجری مطابق اٹھارہ سو چھ (۱۸۰۶) سن عیسوی میں وہیں انکی آخری آرام گاہ بھی بنی ۔ باباغلام شاہ بادشاہ کسی ایک گروہ یا مذہب کے

ماننے والوں کے لئے نہیں تھے۔ بلکہ انکی کرامات سے پتہ چلتا ہے کہ صوفی کامل کا وجود آیہء رحمت تھا۔انکی سخاوت میٹھے پانی کے رواں دریا جیسی تھی۔ انکا فیض سورج کی طرح شاہ و گدا کے لئے یکساں تھا۔ کبھی تو وہ اپنے جسمِ لطیف سے کسی بہتے ہوئے سردار کو بالوں سے پکڑ کر طوفانی دریا میں ڈوبنے سے بچاتے ہیں اور کبھی گلاب سنگھ ڈوگرے کو فتح یابی کا مژدہ سناتے ہیں۔ مجھے ایک یہی بات سمجھ آئی ہے۔بابا غلام بادشاہ سب کے لئے تھے۔ آج بھی ان کے آستانے پر عقیدمندوں کے تانتے لگے رہتے ہیں۔بابا غلام شاہ بادشاہ کی یہ بھی کوئی کم کرامت نہیں کہ بابا غلام شاہ بادشاہ یونورسٹی کی تعمیر کے لئے جو کروڑوں روپے خرچ ہوئے ان میں بیشتر حصہ او قاف انتظامیہ شاہدرہ زیارت نے مہیا کیا ہے۔اور آج بھی فیوض و برکات کا یہ سلسلہ جاری ہے۔ شعر

صبح روشن سے رابطے میں ہوں، میں بھی جلتے ہوئے دیے میں ہوں

برگیڈیر خدا بخش

جموں کٹھوعہ کے رہنے والے تھے برگیڈیر نام سے مشہور تھے مہاراجہ جموں کے آرمی چیف بھی رہے۔ جموں و کشمیر کے گوجروں میں پہلے پڑھے لکھے گوجر کٹھوعہ ضلع کے تھے۔ برگیڈئر صاحب علم و دانش متانت سنجیدگی اور پرہیزگری کی اعلی مثال تھے۔جموں چیرٹ ایبل ٹرسٹ عقیدتاً انہی سے منسوب ہے۔ کانگرس کے مشہور رہنما اور سابقہ منسٹر چوہدری تاج محی الدین انہی کے فرزند ہیں۔

چوہدری بلند خان ہکلا اکھنور والے

مہاراجہ پرتاب سنگھ کے مشیر تھے صاحب کرسی انکی اسطلاحات اور دانش کی باتیں مشہور ہیں انہوں نے پاکستان لاہور سے پڑھے لکھے اساتذہ بلوائے۔اور جموں میں تعلمی نظام کو بہتر بنایا۔ اکھنور اور کٹھوعہ سے اس وقت کی پرجا سبھا کے نمائیندے بھی گوجر ہوا کرتے ملکی تقسیم کے بعد یہ لوگ ہجرت کرکے پاکستان چلے گئے۔اسطرح جموں کے نواحی اضلاع کٹھوعہ اور اکھنور کے گوجروں کا سیاسی تسلط اور بلادستی ہمیشہ کے لئے ختم ہوگئی۔اور ملکی تقسیم کے بعد یہاں گوجروں کو مولی گاجر کی طرح کاٹا گیا۔ آج تک اس قوم کی کے افراد ماٹو پر دستاویزان حاصل کرتے ہیں انکی آبادکاری کا مسئلہ تعطل والتوا میں پڑا ہے۔

پاپا میاں شیخ عبداللہ

پاپا میاں کا اصلی نام ٹھاکر داس تھا۔ یہ قدیم پونچھ کے گاوں بھانسی سدھنوتی کے سدھن راجپوت خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ انکے دو بڑے بھائی ہری سنگھ اور اوتار سنگھ تھے ہری سنگھ کا پوتا نریندر سنگھ تلوار پونچھ کا سرگرم سیاست دان و صحافی ہے۔اور اوتار سنگھ کا نواسا سردار موہن سنگھ وکیل تھا۔ پونچھ تاریخ کے آئینہ میں، **محمد الدین بانڈے**

بقول مسعود چودھری یہی وجہہ تھی کہ علی گڑھ میں ایل۔ایل۔بی کے دوران (پاپا میاں کی بیٹی اور اپنی خالہ) ممتاز حیدر جو ان دنوں علی گڑھ وومن کالج کی پرنسپل تھیں کے گھر سردار سوہن سنگھ نے خوب ضیافتیں اڑائیں۔اور تاحیات ممتاز

حیدر دختر پاپا میاں اور سجاد حیدر وغیرہ سے مراسم بوجہہ دیرینہ رشتہ قائم رہے۔ سردار سوہن سنگھ علی گڑھ میں مسعود چودھری کے ہم جماعتی تھے۔ اب انتقال کر گئے ہیں۔

پاپا میاں نے اپنی بیٹیوں کو اعلی تعلیم دی، تعلیمِ نسواں کا عملی ثبوت پیش کیا۔ سچ کہا جائے تو سر سید خاں بھی تعلیم نسواں کے بارہ میں کچھ زیادہ نہیں کر پائے تھے۔ علامہ اقبال کو بھی عورتوں کی کھلی حمایت کرنے کی جرات نہیں پڑی تھی لیکن پاپا میاں نے برّ صغیر میں علی گڑھ یونیورسٹی سے ہی تعلیمِ نسواں کی تحریک چلائی۔ اس طرح پونچھ کی دھرتی کے عظیم فرزند، پاپا میاں تعلیم نسواں کے معمار اول ہیں۔ انکی بیٹیوں نے بھی وہ کارہائے نمایاں سر انجام دئے ہیں جنکی کوئی دوسری مثال نہیں ملتی۔

انیس سو دو سن عیسوی میں وحید جہاں سے پاپا میاں کی دہلی کے زینت محل میں شادی ہوئی تھی۔ اس شادی کی سالگرہ کو یومِ بانیاں کے طور پر منایا جاتا ہے۔ پاپا میاں نے یہ وومین کالج قائم کر کے انسانیت اور خصوصی طور پر خواتین کی خود مختاری کی سمت اہم رول ادا کیا ہے۔

شدید مخالفتوں کے باوجود بھی پاپا میاں نے وہ عظیم کام انجام دیا۔ جسے فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ انہوں نے یہ بھی ہدایت کی کہ کالج لائبریری اور مولانا آزاد لائبریری سے طالبات زیادہ سے زیادہ استفادہ کریں تاکہ بڑی سرکاری ملازمتوں اور انڈین ایڈمنسٹریٹو سروسیز میں بھی منتخب ہو سکیں۔ انکی عظیم کارکردیوں کے صلہ میں ۱۹۶۴ء میں بھارتیہ سرکار نے انہیں پدم بھشن کے ایوارڈ سے نوازا۔

پاپا میاں نے اپنی ساری دولت گھر بار فروخت کر کے تمام رقم علی گڑھ مسلم یونیورسٹی پر خرچ کر دی۔ اس طرح وراثت سے محروم ہو کر انکا اکلوتا بیٹا بمبئی چلا گیا۔ تاریخ انسانی میں شاید ایسے لوگ بہت کم ہوتے ہیں۔ انیس سو ستاسٹھ سن عیسوی میں علی گڑھ ء میں بانوے سال کی عمر میں پاپا میاں وفات پا گئے۔ اور وہ فخر روزگار انسان، ولی اللہ وہیں آسودہء خاک ہے۔ انکی تعلیم نسواں کی تحریک بر صغیر میں زندہ ہے۔ ان کے حیات افروز افکار سے پتہ چلتا ہے کہ بڑے لوگ مرتے نہیں بلکہ وہ اپنی عمل داری اور فیض رسانی کی بنا پر وہ زندہ جاوید ہیں۔

سردار فتح محمد کریلوی

معرکہءِ اس خاک پہ گزرا ہے دار و گیر کا
ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

فتح محمد کریلوی کریلہ مجھان جو کہ آزادی سے پہلے مینڈر کا حصہ تھا۔ راجہ بلدیو سنگھ کے عہد میں پونچھ ریاست سے پرائمری کلاس میں فسٹ پوزیشن حاصل کی۔ اس کے بعد محکم پولیس میں بھرتی ہو گئے اور پھلور پنجاب میں نارتھن زون لیول پر فسٹ پوزیشن حاصل کی۔ لیکن ڈوگرہ دور حکومت میں انہیں نظر انداز کیا گیا اور قابلیت و استحاق کے باوجود انکو پرموشن نہ مل سکی۔ لہذا کچھ تو دلبرداشتہ ہو کر اور کچھ پہلے ہی سے سیاسی سوجھ بوجھ اور ذوق وشوق رکھتے تھے۔ مینڈر سے تینتیس سال کی عمر میں انیس سو بتیس (۱۹۳۲) سن عیسوی میں پرجا سبھا کے پہلے ایم۔ ایل۔ اے منتخب ہوئے تھے۔ اور

مسلم کانفرنس کے سرکردہ لیڈر بھی تھے۔نام نہاد آزاد کشمیر کی تشکیل میں انکا نمایاں رول رہا۔ مسلم لیگ سے مل کر علاقے کی سالمیت کو زبردست دھچکا لگا۔

پونچھ راجوری کی سیاست شروع ہی سے نسلی و طبقاتی بنیادوں پر استوار ہوئی۔ یہاں قبیلے ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کے درپے رہے۔ مینڈر سے فتح محمد کریلوی عوامی تحریک کے سربراہ تھے۔ سردر غلام محمد گکھڑ، سردار سخی ولایت خان ڈُلّی، سرادار فضل احمد خان وغیرہ انکے حامیوں میں سے تھے۔ چنڈک پونچھ سے کئی دوسرے ڈُلّی حضرات بھی ان کے خیر اندیش تھے۔ سردار فتح محمد کریلوی کے بارہ میں مقبوضہ کشمیر کے ادیب وسیاسی شخصیت اے آر ساغر لکھتے ہیں۔

"ایک ایک کر کے میرے تمام پرانے ساتھی اٹھ گئے اور میں بھی ابھی لبِ گور ہوں افسوس ہے کہ ہمارے جزبہ کا کوئی رنگ ہماری نوجواں نسل پر نہیں نظر آتا" مزید ساغر صاحب مرحوم نے سردار فتح محمد خان کریلوی کی حاضر دماغی سیاسی حکمت، عمل اور اعلی سیاسی بصیرت کا ذکر کیا ہے۔

چودھری غلام حسین لسانوی اور چودھری محمد اسلم لسانوی

پرانے عہد میں گوجر قبائل مجموعی طور پر پامال تھے۔ ان کو یکجا کرنے اور انہیں انکے حقوق کے حصول کی جدوجہد پر ابھارنے والے پونچھ کے پہلے بڑے گوجر لیڈر چوہدری غلام حسین تھے۔انہوں نے لوگوں میں سیاسی شعور اجاگر کرنے کے علاوہ ان کے حقوق دلانے کی مہم تیز کی۔ ۱۹۳۰ء کے بعد گوجروں کی حالت ناگُفتہ بہ

تھی۔اس کے پیشِ نظر انہوں نے گجر گزٹ اخبار نکلوایا اور گوجر جاٹ کانفرنس میں نمایاں رول ادا کیا۔ جس کا مقصد گوجروں اور جاٹوں کو زمینداری نظام کے خلاف صف آراء کرنا اور انکے اپنے حقوق کا تحفظ و دفاع کرنا تھا۔

گورجر جاٹ کانفرنس کو فعال بنانے میں انہوں نے بڑی تگ و دو کی۔بے شک وہ خفتہ گوجر قوم کو بیدار کرنے والے عظیم رہنما تھے۔ انکے بنائے گئے پلیٹ فارم کو چوہدری محمد اسلم مرحوم نے مزید استحکام بخشا۔چوہدری غلام حسین لسانوی نے پیر جماعت علی شاہ اور دیگر راجپوت رہنماوں مثلاً فتح محمد کریلوی کو زبردست چیلنج دیا۔اس زمانے میں شاید دشوار کام تھا۔انکے فرزند چوہدری محمد اسلم مرحوم بڑے قد کے لیڈر تھے کئی سال کانگرس سرکار میں کیبنٹ منسٹر رہے۔ مرحوم خُلق عظیم کی دولت سے مالامال تھے۔ آجکل انکے صاحبزادے چوہدری محمد اکرم ممبر قانون ساز اسمبلی ہیں۔

غرور تند ہواوں کا یوں بھی توڑا ہے
چراغ ہاتھ پر رکھ کر گزر گئے ہیں لوگ

کرشن چندر

کرشن چندر راجستھانی نژاد تھے۔ لیکن انکے والد پونچھ میں طبیب تھے۔لہذا وہ یہیں پلے بڑھے۔بنیادی تعلیم بھی یہیں حاصل کی۔انہوں نے اپنی جوانی دیوانی کا کچھ حِصّہ بھی یہیں گزارا۔اسی لیے وہ زندگی بھر پونچھ کو نہ بھلا سکے اور انکے رشحاتِ قلم سے بھی اسی مٹی کی بوئے دلاویز آتی ہے۔انکی شگفتہ تحریر کو بطور گواہ پیش کرتا ہوں:

میرا شہر تھا جس میں مختلف نسلیں اور جاتیاں، دھرم اور مذہب، خواب اور عقیدے، مختلف رنگوں کی ڈوریاں بٹتے، آپس الجھتے سلجھتے، گھلتے ملتے، جلوہء حسنِ ہزار رنگ کی طرح آشکار ہوتے تھے۔

مجھے ہندو مسلم فسادوں کا غم نہیں ہے ایک دن لوگ ان فسادوں کو بھی بھول جائیں گے۔

مجھے مغل راج، سکھ راج، ڈوگرہ راج، انگریزی راج کے جانے کا بھی غم نہیں کیونکہ میرے پاس لوگوں کی طرح کھونے کے لئے بھی کچھ نہیں۔ مگر وہ شہر مجھے نہیں بھولتا ہے۔ جس کے آئینہ خانہ میں نے پرانے ہندوستان کی آپس میں مل بیٹھ کر امن و چین سے رہنے کی بھری ہوئی روایت دیکھی تھی۔

اس شہر کے عکس اکثر میری تنہائیوں میں چمک اٹھتے ہیں اور یاد دلاتے ہیں۔ اس خوبصورتی کی جسے ہم نے اپنی حماقت سے جلاوطن کر دیا۔ کیسے میں اس شہر کو بھلاوں؟ کیسے اس کے قاتلوں کو معاف کروں۔ حالانکہ آج کوئی اس قتل کی منصفی کرنے والا نہیں کیونکہ وہ میرا شہر تھا۔ کیونکہ وہ میرا شہر تھا اور اسکے مرنے کا غم مجھ کو ہے۔ (بحوالہ کرشن چندر: حسن کی جلاوطنی مٹی کے صنم)

ایک عجیب بات کہتا ہوں۔ ممکن ہے میرے بہت سے دوستوں کو برا بھی لگے۔ مگر ہندو، تاریخ، ہندو تمدن کو یکسر کاٹ کر آپ کسی ٹھوس پاکستانی کلچر کی بنیاد نہیں رکھ سکتے۔ جس طرح مسلم، تہذیب، مسلم تاریخ اور مسلم تمدن کے بغیر ہندوستانی کلچر کا کوئی شعبہ مکمل نہیں ہو سکتا۔ تاج اور عطر، گلاب اور غزل

، شیروانی اور گنبد، جامع مسجد کے مینار اور صوفیوں کے مزار غائب کر کے ہم اپنے لئے کسی بھرے بھُرے متنوع ہندوستانی کلچر کا تصوّر نہیں کر سکتے۔ اسی طرح پاکستانی کلچر کا مسئلہ پرانے ہندو تہذیبی ورثے کو جلاوطن کر دینے سے نہیں سدھر سکتا۔

پاکستان دبی زبان میں موہنجو دارا اور بدھ کی مورتیوں کا ذکر تو کرتے ہیں۔ مگر تکشِ شلا (ٹیکسلا) کو بھول جاتے ہیں۔ ہیں وہ راجہ جے پال جس نے سبکتگین کا مقابلہ کیا تھا وہ ایک پنجابی ہندو تھا۔ وہ مہاراجہ پورس جس نے سکندرِ اعظم کے دانت کھٹے کئے وہ بھی ایک پنجابی ہندو تھا اور جہلم کا رہنے والا تھا۔

ڈاکٹر اقبال ذات کے برہمن تھے اور اپنے برہمن ہونے پر فخر کرتے تھے گرونانک نے مغربی پاکستان میں جنم لیا کس کو بھولو گے۔؟ اور کس کس کو یاد کروگے؟ وہ کلچر جس کی بنیاد بھولنے اور یاد نہ کرنے پر رکھی جائے کس طرح کا مجروح اور مذبوح کلچر ہو گا مگر میرا کچھ ایسا خیال ہے۔ کسی بھی انسان یا ملک کے لئے درزی کے کپڑے کی طرح کاٹ کر کلچر بنانا بہت مشکل تھا۔

کلچر کی جڑیں بہت گہری ہوتی ہیں۔ اور انسان کی یاد کے مقابلے میں کلچر کی یاد بہت لمبی ہوتی ہے اور دیرپا ہوتی ہے۔ انسان بھول جاتا ہے مگر کلچر نہیں بھولتا انسان اپنے ضمیر کی آواز دبا سکتا ہے۔ کلچر کے ضمیر کی آواز نہیں دبائی جا سکتی ہے۔

انسان اپنی شروعات چھپا سکتا ہے کلچر اپنی شروعات پر فخر کرتا ہے۔ آج مصر، ایران اور دوسرے مُسلم ممالک میں کھود کھود کر اپنی شروعات ڈھونڈی جا رہی

ہے۔ور ان پر فخر کیا جارہا ہے۔پاکستانی دانشوروں کو بھی ایک روز اسی راستہ پر چلنا ہو گا۔کفر بغیر اسلام کے مکمل نہیں ہو سکتا۔

گوجروں کی مشکلات اور مصائب کے بارہ میں کرشن چندر اپنے ناول مٹی کے صنم جو دراصل میں افسانوی انداز میں لکھی گئی سوانح حیات ہی تو ہے۔میں رقمطراز ہیں:

"چوتھے دن جب ہم برف میں راستہ بناتے ہوئے چلے تو میں نے حاجی پیر کے اس طرف دوسری اترائی میں گھاٹی میں ایک گوجر کی لاش دیکھی۔جو سردی سے اکڑ کر بالکل نیلی ہو گئی تھی۔

وہ گوجر صرف گھٹنوں تک لٹھے کا ایک نیکر نما پائجامہ پہنے ہوئے تھا۔اس کے پاوں میں دھیال (دھان کے خوشوں سے بٹی ہوئی رسی سے بنے ہوئے) چپل تھے۔اس کا منہ کھلا تھا اور اس میں میں سے نسوار بھرے پیلے دانت نظر آرہے تھے۔اس کے گنجے سر پر ایک مخروطی ٹوپی تھی اور اس ٹوپی کے اوپر مضبوط بٹی ہوئی رسیوں میں الجھا ہوا،نمک کا ایک بہت بڑا ڈھیلا نظر آرہا تھا۔جس کا وزن بلا مبالغہ ڈیڑھ من کے قریب ہو گا۔وہ نمک کا ڈھیلا اٹھائے چلا آرہا تھا۔کہ برف اور دھند اور طوفان میں کہیں راستہ بھول کر اس کھائی میں گر پڑا تھا۔اور گرتے ہی ختم ہو گیا۔

مگر یہ نمک کا ڈھیلا کیوں اٹھائے ہوئے ہے؟ میں نے سرور خان کمپونڈر سے پوچھا۔سرور خان نے افسوس سے سر ہلا کے کہا۔ہمارے علاقے میں نمک تو ہوتا نہیں نمک پنجاب سے آتا ہے۔

کھیوڑے کی کان کا نمک سب سے اعلی ہوتا ہے۔مگر سردی کے دنوں میں جب پنجاب جانے کے راستے برفباری سے بند ہو جاتے ہیں یہاں کے بنئے اور دکاندار نمک اس قدر مہنگا کر دیتے ہیں۔مزید سرور خان نے کہا: "کاکا" ہمارے دیس کے غریب کسان اور گوجر مویشی پالتے ہیں اور جنہیں نہ صرف کھانے کے لئے بلکہ مویشیوں کو چٹانے کے لئے بھی نمک کی ضرورت پڑتی ہے۔وہ اس مہنگے بھاؤ سے بازار سے نمک نہیں خرید سکتے۔اس لئے یہ لوگ اوڑی سے کہالے،کوہ مری سے،راولپنڈی سے،گوجر خاں سے جہاں جہاں سے ان کو نمک ملتا ہے۔اپنے سر (اور کندھوں) پر اٹھا کر،کئی کئی دن پیدل چل کے سینکڑوں میلوں کی مسافت طے کر کے لاتے ہیں۔عجیب بات ہے میں نے آج تک نمک کی اہمیت کو سمجھا ہی نہیں تھا۔اکثر کھانے کی میز پر میں نے کئی بار شکایت کی تھی ۔کہ باورچی کھانے میں نمک زیادہ کیوں ڈال دیتا ہے؟ یہ کہ نمک کبھی کم بھی پڑ سکتا ہے اور نمک کے لئے کوئی جان بھی دے سکتا تھا۔یہ بات آج تک سمجھ میں نہیں آئی تھی۔

گوجر مرا پڑا ہے نمک برف میں پگھل رہا ہے یہ تصویر میں نے تصور کے نہانے خانے میں ہزار بار دیکھی ہے کبھی سمجھ میں نہیں آئی۔

(صفحہ ۱۶ حاجی پیر کا بیٹا،مٹی کے صنم)

لفظ اندھے کبھی نہیں ہوتے
بولنے والے سوچتے ہی نہیں

چراغ حسن حسرت

چراغ حسن حسرت ، انیس سو چار عیسوی میں بمقام پونچھ (کشمیر) میں پیدا ہوئے۔ حصول تعلیم کے بعد انہوں نے کلکتہ میں اخبار نویسی کا کام شروع کیا اور اخبار (نئی دنیا) کے ذریعہ ایک مزاح نگار کی حیثیت سے مشہور ہوئے۔ اس کے بعد لاہور آگئے اور اخبار (زمیندار) ،(شہباز)،اور (امروز) میں سندباد جہازی کے نام سے مزاحیہ کالم لکھتے رہے۔وہ اپنے کالموں میں کولمبس اور سند باد جہازی کا قلمی نام بھی استعمال کرتے رہے۔

حسرت نے ایک ہفت روزہ رسالہ (شیرازہ) بھی جاری کیا۔ اس کے بیشتر مضامین مزاحیہ ہوا کرتے تھے لیکن بہت جلد اسے چھوڑ کر ریڈیو میں ملازم ہوگئے۔ کچھ دنوں محکمہ پنچائیت پنجاب کے ہفت روزہ "ترجمان" کی ادارت سنبھال لی۔ دوسری جنگ عظیم میں فوجی اخبار سے وابستہ ہو جاتے ہیں اور میجر کے عہدے تک جا پہنچے۔

فوجی ملازمت کے سلسلہ میں برما اور ملایا بھی جانا پڑا۔ قیام پاکستان کے بعد (امروز) کی ادارت سنبھال لی۔ لیکن بہت جلد یہ ملازمت ترک کرکے ریڈیو پاکستان میں قومی پروگرام کے ڈائریکٹر ہوگئے۔ حسرت انیس سو پچپن سن عیسوی میں لاہور میں وفات پائی۔

دیانند کپور

پونچھ کی پہلی اخبار پربھات دیانند کپور نے نکالی۔ دیانند کپور نے اردو اخبار میں عوام کی ترجمانی کی۔ انکا اخبار بالخصوص اقلیتی طبقہ کی صدائے بازگشت تھی مگر تھی معیاری۔ انہوں نے پونچھی افواہیں لکھنے کی مثالیں بھی پیش کیں اس کے جواب میں نبی بخش نظامی نے المجاھد کی بنیاد ڈالی۔

بے شک دیانند کپور نے پونچھ کی صحافت کا معیار بلند کیا۔ انکی افواہ نگاری اپنی مثال آپ ہے۔ انکی اخبار کی سرخیاں بھی جاذبِ نظر تھیں۔ مثلاً پربھات کے شمارہ جو بروز بدھوار ۱۳پو۰ بکرمی ۱۹۹۱ بمطابق ۱۹۳۴عیسوی کا ہے میں پونچھ کے بجٹ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

اب اپنے بخت خفتہ کا کریں شکوہ کہاں تک ہم
کہ پھولوں کی رگ جاں بھی بنی ہے نوک نشتر کی

محمد الدین فوق سابق وزیر پونچھ کے بعد جس کی لاٹھی اس کی بھینس کے مصداق سنیارٹی جونیارٹی، قابلیت، قواعد ضوابط و زبان کی جو مٹی پلید ہوئی اور جس جس طرح حق و ناحق کی پالیسی پردہ پوشی کی نذر ہوتی رہی ہمیں امید تھی کہ موجودہ وزیر صاحب جو انصاف کے پیش نظر اس اندھیر گردی کا سد باب کریں گے۔ اور موجودہ بجٹ و تخفیف میں اس کا خیال رکھا جائے گا لیکن جائے پر ملال ان دیرینہ بے انصافیوں کی اشک شوئی تو کجا رہی، سہی کس بھی پوری کر دی گئی ہے۔ آج پونچھ میں تجارت و زراعت کے بعد غریب اور بے بس ملازموں کا ملازمتوں میں جو حشر ہوا ہے وہ بجٹ کے

اعداد و شمار سے واضح ہے جوڈیشل اور جنگلات اور مال کے ریٹائرڈان بیک قلم اڑادئے گئے۔ کیونکہ ان کی ضرورت نہ تھی لیکن سرکاری دفتر اور وزارت کے ریٹائرڈان کے نام بدل دینے سے مزے لوٹیں، یہ صریحا پردہ دری ہے۔ ہسپتال پبلک ورک، کسٹم جوڈیشل میں تخفیف کا کلہاڑا اس شدت سے گردش میں آیا کہ تقریباصفایا کیا گیا۔ جہاں کاٹ چھانٹ کی گئی غریب پر ہی نزلہ گرا اور درجنوں ساٹھ سالہ حوالداران اور انسپیکٹران تخفیف کے بھوت سے محفوظ ہیں"۔

نبی بخش نظامی

نبی بخش نظامی، چراغ حسن حسرت کے برادر نسبتی تھے اور پونچھ کی پہلی ملی اخبار المجاہد کے مدیر بھی تھے نہایت نڈر اور سچے انسان تھے۔ انہوں نے پونچھ میں صحافت کو فروغ دیا۔ ۱۹۰۵ میں پونچھ میں پہلا ہائی اسکول کھولا گیا اور اسکے بعد راجوری میں۔ میٹرک کا امتحان دینے کے لئے امیدوار براستہ حاجی پیر، راولپنڈی جایا کرتے تھے۔ اور راجوری سے (براستہ پیر بڈھیسر) کوٹلی میں۔ اسکے علاوہ کوئی اسکول نہیں تھا۔ بعد میں سرنکوٹ ہائی اسکول سرنکوٹ منظور ہوا۔ عوام کو راجوں کی فٹنیگ اور رکھوں میں ہوڑیا چاڑ سے ہی فرصت نہیں ملتی تھی۔

نبی بخش نظامی پونچھ کی زوردار آواز تھے۔ انہوں نے ڈوگرا راجاوں انکے وزیروں کی نیند حرام کر رکھی تھی اور یکے بعد دیگرے کئی وزیروں کے بستر بھی گول کروائے۔ مورخ کشمیر محمد الدین فوق نے انکی کارکردگی کو سراہتے ہوئے لکھا تھا۔

پونچھ کے نامہ نگاروں کے مضامین زیادہ تر ذاتیات اور باہمی چپقلس وعداوت کے بخارات پر مُشتمل ہوتے ہیں۔ اور اخبارات کو تو وہ بُخارات نکالنے کا آلہ تصوّر کرتے ہیں۔ لیکن نظامی صاحب نے جو کچھ لکھا رعایا کی فلاح و بہبود کے لئے لکھا۔ جس حاکم میں کوئی عیب ظاہر کیا وہ بھی اس کی اور رعایا کی بھلائی کے لئے کیا۔ میرے خیال میں آج کے بے سُرے صحافیوں کے یہی معیار کافی ہے۔

میں سمجھتا ہوں انکی سوانح عمری پونچھ کے ایک عہد نصف صدی کی مفصل و مکمل تاریخ ہے جس میں ممکن ہے کہ انہوں نے کسی مصلحت کے تحت چشم پوشی برتی ہو یا کہیں کہیں مبالغہ آرائی سے بھی کام لیا ہو۔ مجموعی طور پر صدق وصفائی کا یہ عالم ہے کہ نظامی صاحب مرحوم نے واقعات کے بہاو میں گدلاہٹ نہیں پیدا ہونے دی۔ مصفا وآب شفاف جیسی تحریر کی تہہ میں خُرد سے خُرد واقعاتی ریزہ کاری کا مشاہدہ کیا جاسکتا ہے۔

پونچھ میں ڈوگرہ راجاوں کی چیرہ دستیوں سے لیکر قبائیلوں اور پٹھانوں کی لوٹ مار اور جہاد کے نام پر غنائم اور عورتوں کے اِغوا گورجر عورتوں کی مظلومیت کے واقعات اور انکی زبوں حالی کو سامنے لاکر نبی بخش نظامی نے بیباک صحافی کا کردار ادا کیا ہے۔ اور صحافت کا معیار قائم کیا۔

حساس قاری کو یہ کتاب پڑھتے ہوئے یوں لگتا ہے کہ وہ بھی نبی بخش نظامی کے ساتھ محوِ سفر ہے۔ نبی بخش نظامی، خواجہ حسن نظامی بے باک اور مخلص مریدوں میں سے تھے۔ نبی بخش نظامی نے نہ صرف مولانا مودودی، شیخ محمد عبداللہ حسن نظامی سے

کئی معاملوں پر مزاکرات کیئے ،بلکہ کئی مشکل سوالات کر کے انہیں لاجواب بھی کیا۔ مودودی صاحب کو تو مباہلہ کے لئے بھی للکارا مگر جواب ندارد۔ اسی طرح جلال پور کے عسکری نظام سے موافقت کا اظہار کرنے پر نبی بخش نظامی نے حسن نظامی کو تنقید کا ہدف بنایا۔ جس کا اعتراف خواجہ حسن نظامی نے یہ کہتے ہوئے کیا۔

"خوش نصیب وہ مرشد ہے جس کی رہنمائی کشمیر کے پہاڑوں کی چوٹیوں پر بیٹھے ہوئے ایک مریدنے کی اور مجھے ایک بڑی غلطی کے ارتکاب سے بچالیا۔ میرے خیال میں پونچھ کے لوگوں کی سرشت میں یہ جبلت ہے کہ وہ اپنے فخر روزگار پیروں اور مرشدوں کی غلطیاں کا اتباع نہیں کرتے بلکہ انتباہ کرتے ہیں۔"

خالد نظامی

خالد نظامی، حسن نظامی کے فرزندِ ارجمند تھے اور مولانا چراغ حسن حسرت کے بھانجے۔

اپنی سوانح حیات میں خالد نظامی ۱۹۴۷ءکے واقعات بھی لکھے۔ ملکی تقسیم سے پہلے جب ابھی پاکستان ایک خواب اور ایک امید تھی جو کبھی پوری نہیں ہو سکی۔ لکھتے ہیں:

ہم بچے تھے اتنا جانتے تھے کہ قائد اعظم محمد علی جناح اور ہندوؤں کے نیتا مہاتما گاندھی کی ذات سے وابستہ کر رکھا تھا۔ ہم اتنا جانتے تھے کہ قائد اعظم خوش شکل اور خوش پوش تھے جب کہ مہاتما گاندھی کے پاس تن ڈھانپنے کو بس ایک لنگوٹی تھی۔ وہ لاٹھی کے سہارے چلتے تھے اور انکی ایک پالتو بکری تھی جو انکے آگے پیچھے پھرتی تھی۔ یوں بکری ہندولڑکوں کی چڑ بن گئی تھی۔ ہر روز چھٹی ہوتے ہی ہندو اور

مسلمان طلباء کے گروہ وکٹوریہ جوبلی ہائی اسکول کے سامنے پڑِھ باندھ کر نعرہ بازی کیا کرتے تھے ہندولڑکے آواز اٹھاتے۔

اکھنڈ بھارت امر رہے

جواب میں نعرہ لگتا

لے کے رہیں گے۔۔۔۔

تھوڑی ہی دیر میں یہ نعرے گڈ مڈ ہو جاتے دونوں گروہ پاؤں پٹک پٹک کر دھول اڑاتے ، کتے بلیوں کی آواز نکالتے، گتکے کے انداز میں تختیاں لہرا کر ایک دوسرے کو دھمکاتے جلد ہی یہ سارا ہنگامہ فرو ہو جاتا اور ہم سب کچھ بھول بھال کر اپنے اپنے گھر کی راہ لیتے۔

خالد نظامی لکھتے ہیں ہندوستان کے تقسیم ہوتے ہی حالات کی نہج بدل گئی تھی۔ ہمارے ہندو دوست ہم سے کترانے لگے تھے۔ کبھی ملتے توانکے چہروں پر عجب سی خِفّت ہوتی تھی جیسے وہ ہاکی کا فائنل میچ ہار گئے ہوں پھر جلد ہی اس خِفّت پر غُصّے کی چھاپ ابھرنے لگی اور ہمارے راستے الگ ہوتے گئے۔

خالد نظامی گھر میں پہاڑی بولتے تھے لیکن گوجری بھی جانتے تھے کہتے ہیں:

چن مہاڑا چڑھیا، ڈھکیاں نے اوہلے

ڈھائی چھوڑو ٹھکیاں تے چن مہاڑا بولے

(میرا چاند پہاڑوں کی اوٹ سے طلوع ہو رہا ہے یہ پہاڑیاں گرا دو کہ میرا چاند روبرو ہو کر مجھ سے بات کرے۔)

تاریخ شاہد ہے کہ پورے ہندوستان اور پاکستان اور کشمیر میں گوجری زبان کا پہلا ڈراما" پھر چن چڑھے گو" لکھنے والا اور کوئی نہیں تھا بلکہ نبی بخش نظامی کے صاحب زادے مشہور و نامور سفیر و ادیب خالد نظامی ہی تھے۔

محمد شریف طارق

آپ ۱۹۳۶ء میں موضع کالابن تحصیل مینڈھر میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۶۰ء میں علی مسلم یونیورسٹی سے ایل ایل بی کی ڈگری حاصل کی ضلع پونچھ میں گوجر قبیلے سے پہلے ایڈوکیٹ نوجوان تھے۔ ۱۹۶۲ء میں بطور الیکشن امیدوار فارم بھرا لیکن بعض لوگوں نے سازش کر کے فارم ریجیکٹ کروادیا۔ یہاں کے کھڑپینچ لوگ مخالف تھے۔ ۱۹۶۵ء میں جانی خطرہ کے پیش نظر پاکستان چلے گئے۔ اور میرپور میں وکالت شروع کی۔ کئی کتابوں کے مصنف ہیں۔ خونی لکیر، کشمیر ان سٹرینگیو لیشن، پنجال دے اتھروں،، کشمیر ڈوگرہ، قائداعظم بطور وکیل، پنجال کو چن اور حدیث دل۔ سیاست،، محبت حالات حاضرہ تاریخ کشمیر آپکے موضوعات تھے۔ احباب کی بے حسی اور اغیار کی ریشہ دوانیوں کا جم کر بیان کیا ہے۔ بعض مبصرین مثلاً مولانا امیر محمد شمسی راجوروی کے مطابق انکی کتاب، جموں وکشمیر کی آزادی کی کہانی، تاریخ کی زبانی بہت اہمیت کی حامل ہے۔ مگر جموں کی کئی بڑے صحافیوں اور مصنفوں نے انکے نکتہء نظر سے اختلاف کیا ہے۔

نسیم پونچھی

چودھری بشیر الدین نسیم پونچھی بمقام گاوں گورسائی انیس سو چالیس (۱۹۴۰) سن عیسوی میں پیدا ہوئے۔ ملکی تقسیم کے دور میں انکے والدین پاکستان منتقل

ہو گئے۔ انکے ایک ساتھی محمد بشر تھے بشر اور بشیر کی پہلی جوڑی تھی جنہوں نے لاہور سے ایف اے کیا۔ دونوں ہی لاہور میڈیکل کالج میں سیلکٹ ہو گئے لیکن نسیم پونچھ ۱۹۶۰ سن عیسوی واپس چلے آئے۔ اس دور میں انکی مثال دی جاتی تھی۔ مالی تنگی اور افلاس کے باوجود انہوں نے ایک بائیس سال کی عمر پونچھ ڈگری کالج سے گریجویشن کی ۔ لیکن آگے تعلیم نہیں حاصل کر سکے۔ ریڈیو کشمیر میں ملازم ہو گئے۔ بعد ازاں انیس سو اٹھہتر (۱۹۷۸ء) میں ریاستی کلچرل اکیڈمی میں گوجری شیرازہ کے پہلے اڈیٹر بنے۔ انہوں نے گوجری زبان کے سلسلہ میں اہم کام کیا۔ گوجری لغات چھ جلدوں پر مشتمل انکا کارنامہ ہے۔ نین سلکھنام کھیچل وغیرہ تصانیف کے علاوہ وہ گوجری انشائیہ کے بھی بانی ہیں۔ انہوں نے مشتاق یوسفی کے پیٹرن پر انشائے لکھے ہیں جن میں منجھی، سوٹی، وغیرہ قابل تحسین ہیں۔ مثنویات خیام کا ترجمہ کیا ہے اور مثنوی مولانائے روم کا بھی۔

ستائیس جولائی دو ہزار پندرہ (۲۰۱۵ء) کو پچھتر سال کی عمر پا کر راہی ملک عدم ہوئے۔ حق مغفرت کرے۔

جموں وکشمیر کی بعض معاصر شخصیات

آغا اشرف علی

میں پربتوں سے لڑ تا رہا اور چند لوگ
گیلی زمین کھود کے فرہاد ہو گئے

آغا اشرف علی ایک علمی گھرانے کے چشم و چراغ تھے۔ ان کی والدہ بیگم ظفر علی پہلی کشمیری تعلیم یافتہ خاتون تھیں۔ ۱۹۴۷ء کے بعد آغا اشرف علی نے مسلمانان کشمیر میں تعلیم کی زبردست مہم چلائی۔ کیونکہ کشمیر میں مسلمان لوگ تعلیم تو درکنار اسکول کے پچھواڑے سے بھی نہیں گزرتے تھے۔ ۱۹۵۵ء کا ذکر کرتے ہیں کہ وومین کالج میں صرف چار مسلم لڑکیاں زیر تعلیم تھیں اور چالیس غیر مسلم لڑکیاں۔ اسی طرح جب وہ ایس پی کالج میں تھے تو صرف ایک سو گیارہ مسلم لڑکے زیر تعلیم تھے ۔جب کہ غیر مسلموں کی تعداد ایک ہزار تھی جبکہ کہ آبادی کے تناسب سے یہ اعداد ابر عکس ہونے چاہیئے تھے۔ ظاہر ہے اس دور میں ملازمتوں میں بھی یہی تناسب یہی ہوا ہو گا۔

آغا صاحب کہتے ہیں کہ میرے لئے یہ ایک جنگ تھی اور اس طرح میں مسلمان کشمیر کو تعلیم و تربیت دینے کی مہم میں حتی الوسع اپنا تعاون دیا۔

دسمبر ۱۹۵۱ء میں شیخ محمد عبداللہ نے انہیں انسپیکٹر آف اسکول ایجوکیشن تعینات کیا۔ جو ان دنوں صوبائی لیول کے ڈپٹی دائیریکٹر آف اسکول کے برابر کی پوسٹ تھی۔ آغا صاحب کہتے ہیں۔

میں کم و بیش ایک سخت گیر و مطلق العنان شخص تھا۔ میں عدل و انصاف اور علم و دانش کے فروغ کے مسئلہ میں کبھی کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کیا۔

آغا اشرف علی صاحب کہتے ہیں۔ شیخ صاحب کا کوئی بھتیجا ہو یا کونٹینٹ جنرل کا بھائی، میں نے ضرورت اور علمی صلاحیت کو پیش نظر رکھتے ہوئے اساتذہ کے تبادلے کئے۔

آغا اشرف علی صاحب سے مسعود چودھری متاثر ہوئے ہوں یا نہ لیکن ان کا اندازِ فکر اور روش ملتی جلتی ہے۔ مسعود چودھری بھی آغا اشرف علی صاحب کی طرح نہایت جوع البقر اور ندیدہ قسم کے ریڈر ہیں۔

ڈاکٹر آغا اشرف علی نے گورجر دیش چیریٹ ایبل ٹرسٹ کو دیکھ کر اپنی مسرت کا اظہار جن الفاظ میں کیا وہ کچھ یوں تھے۔

"مجھے یقین ہی نہیں آتا۔ اس شخص کو ٹوپیاں اتار کر سلام کرو۔ جزبہ محبت اور سرگرمی عشق کے بغیر کچھ بھی نہیں کیا جا سکتا ہم خوش نصیب لوگ ہیں کہ مسعود صاحب کی دماغی علمی و فکری سطح کے لوگ ہمارے اندر موجود ہیں۔ میں دعا کرتا ہوں یہ اس قسم کا رجحان عام ہو جائے۔"

آغا اشرف علی ریاست جموں و کشمیر کے ماہر تعلیم اور اونچی سطح کی علمی شخصیت ہیں۔ انہوں نے مادری زبان میں تعلیم پر زور دیا۔ اگرچہ ان سے پہلے مسلمانان ہند میں سر راس مسعود اس مہم کا آغاز کر چکے تھے۔ جامعہ ملیہ اسلامی کی بنیاد ڈاکٹر ذاکر حسین نے اسی نظرے پر رکھی تھی۔

فیودر دوستووسکی انکے پسندیدہ مصنف ہیں۔ جو کہتا ہے۔

"آدمی کو اس کی ہنسی سے پہچانا جا سکتا ہے۔ اگر تم کسی آدمی کی ہنسی پسند کرتے ہو تو تم اس شخص کے بارہ وسوخ سے کہہ سکتے ہو کہ وہ اچھا آدمی ہے"۔

نعیم اختر اندرابی

ریاست کی برگزیدہ و مقتدر سیاسی و علمی شخصیت ہیں۔ محکمہ تعلیم میں آپ کی اصلاحی تدابیر نے تہلکہ مچادیا۔ مرکزی حکومت اور بعض دیگر ریاستوں نے بھی آپکے مشوروں کو اپنانے کے لئے کمشن مقرر کئے ہیں۔ آپ پہلے کابینہ وزیر ہیں جنہوں نے تعلیمی نظام پر معنی خیز تنقید کی۔ انڈیا اینٹرنیشنل سینٹر دہلی میں عالمی خواندگی تحریک (ایس ایس اے) کی تقریب کے دوران آپ نے جو دوٹوک بیان دیا اور تمثیل وہ قومی اخباروں نے سراہااور علمی حلقوں میں عزت کی نگاہ سے دیکھا گیا۔

ٹیکنگ ٹائم بمب کی تمثیل:

عالمی خواندگی تحریک ٹِک ٹِک کرتے ہوئے ٹائم بمب کی گھڑی کی طرح ہے۔ جو ہمیں عنقریب ایک بڑی مصیبت و فلاکت میں دھکیلنے والا ہے۔ انہوں نے کہا. اس کا نفاذ ذاتی مفاد کی خاطر اور بڑی رحمی سے کیا گیا ہے۔

انکے برجستہ بیانات سے انسانی ہمدری اور اخلاص ٹپکتا ہے۔ کشمیر میں شرپسند عناصر کی سنگ بازی اور اسکولوں کو بند کرنے پر کشمیر عظمیٰ میں اپنے کرب کا اظہار کچھ یوں کیا تھا۔

"حالیہ واقعات میں قیمتی جانوں کے زیاں اور نوجوانوں کے زخمی ہونے پر ہم سب رنجیدہ ہیں تاہم ہمیں یہ سوچنا ہو گا کہ ہم اپنے بچوں کو کتنی دیر تک اسکولوں سے دور رکھیں گے۔"

ایک دوسرے مقام پر آپ نے بجا کہا:

"بد قسمتی سے موجودہ حالات کے نتیجے میں تعلیم کا شعبہ سب سے زیادہ متاثر ہوا۔ اس شدید نقصان کے نتائج کو مد نظر رکھ کر ہمیں غور کرنا ہو گا جس طرح زندگی میں پانی، راشن، بجلی اور دیگر بنیادی ضروریات کی اہمیت ہے۔"

اسی طرح سماج کی بقاکے لئے تعلیم بنیادی اہمیت کی حامل ہے اور اس سے قبل تعلیمی نقصان کی بھرپائی ناممکن ہو کشمیر میں مثبت سوچ رکھنے والے تمام افراد بشمول علیحدگی پسند لیڈروں کو اس ضمن میں سوچنا چاہئے۔

صاحب ثروت افراد نے پہلے ہی اپنے بچوں کو حصول تعلیم کے لئے کشمیر سے باہر بھیجنے کا سلسلہ شروع کیا ہے۔ تاہم موجودہ نامساعد حالات کا سب سے زیادہ نقصان اوسط درجے اور غریب کنبوں کے بچوں کو بھگتنا پڑ رہا ہے".

بقول امیر مینائی

خنجر چلے کسی پر تڑپتے ہیں ہم امیر
سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے

نعیم اختر صاحب گوجروں کی پسماندگی کے لئے سخت متفکر ہیں۔ لکھتے ہیں :"زمانہ بدل چکا ہے۔ لیکن پامال و پسماندہ قوم بڑی معصومی کے ساتھ ابھی تک اپنے ماضی کی روایات کو سینے سے لگائے ہوئے ہیں۔ قدامت کی طویل وقتی بستہ بندی اور انگوچھے سے اس قوم کو باہر نکالنے کی ضرورت ہے۔"

خدانے آج تک اس قوم کی حالت نہیں بدلی
نہ ہو جس کو خیال آپ اپنی حالت کے بدلنے کا

انہوں نے اس بحران سے نمٹنے کے لیے دوگانہ حکمت پالیسی اور راستہ اختیار کرنے کی رائے بھی دی۔

"گوجروں کی سماجی اقتصادی حالت بہتر بنانے کے لیے مخصوص مصلحت اندیشیوں اور حکمت عملیوں کے بنائے جانے اور انہیں اپنانے کی ضرورت ہے۔ دوسرے اس قوم کے افراد میں عمومی طور پر بیداری کی ایک تحریک پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔"

مسعود چودھری کہتے ہیں کہ ٹرسٹ کے سلسلہ میں نعیم اختر صاحب نے ابتدا ہی سے ہر طرح کی اعانت کی۔ اور بطور وزیر تعلیم انہوں نے ٹرسٹ کے بارہ میں کہا۔

"مسعود صاحب کے زیر اثر ایک معجزہ ہوا ہے"۔

نعیم صاحب کا یہ قول آب زر سے لکھنے کے لائق ہے: محض خواب سے خوشگوار حقیقت میں بدلنے تک میں نے اس ادارے کو بنظرِ غائر دیکھا ہے۔ انفراد کی بنا پر اپنی نوعیت کا یہ پہلا ادارہ ہے۔ قومی ورثے اور مدبرانہ اغراض مقاصد کی علامت بن چکا ہے۔ میں نے ٹرسٹ کے اراکین کو رائے دی ہے کہ وہ بصیرت افروز تحریک کو اس پسماندہ قوم کے تمام افراد عام تک پہنچائیں کیونکہ ابھی اس سماج کا نونہال اندھیروں میں مرجھا رہا ہے۔

محمد یوسف ٹینگ

محمد یوسف ٹینگ صاحب نصف صدی سے ادبی افق پر چھائے ہوئے ہیں ۔ آپ اردو اور کشمیری میں کئی اہم کتابوں کے مصنف ہیں ۔ اور ہرگز کسی کے تعارف کے محتاج نہیں ۔ دو دہائی پہلے میں نے تصوف کے موضوع پر واقعات اکابر کا آغاز کیا

میرے مطالعے کا دور تھا تو میں نے محمد یوسف ٹینگ کی کتاب برجِ نور پڑھی اور انکی دگر تصانیف بھی اللہ اللہ انکے تحقیقی کام کے معیار سے آگاہ ہوا۔ وہ کتابیں میرے لئے دہشت انگیز بھی ثابت ہوئیں اور دیدہ کشا بھی۔ مجھے نہیں لگتا کہ ہماری ریاست میں کوئی بھی موثر نثر نویسی میں ان سے بازی لے سکتا ہے۔ انکی فکری پرواز انکی ایقونتی تمثیل نگاری اور شبیہ سازی کی اپنی ہی شان ہے۔ انکے ہاں ترسیل کا عمل اپنی مکمل اور موثر صورت میں امکان کی بلندی کو چھوتا ہے۔ گرجروں کی ثقافت و تہذیب پر انکے دو تین مضامین جو کہ کتاب گرجر منزل بہ منزل کی زینت بن چکے ہیں کو پڑھ کر احساس ہوا کہ انہوں نے سمندر کو کوزے میں بند کر دیا ہے۔ اختصار ہی انکا اعجاز ہے اور شبیہ سازی انکی نثر کا امتیازی وصف۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی تحریروں کو پڑھنے اور سننے والے عش عش کرنے لگتے ہیں۔

گورجر ٹرسٹ کی تعمیر کے سلسلہ میں انکی دیرانہ قلمی معاونت، مالی امداد اور خدمات کا احاطہ کرنے کے لئے لفظ شاید تھوڑے پڑ جاتے ہیں۔ محمد یوسف ٹینگ صاحب اور ڈاکٹر صابر آفاقی کو شانِ گرجر کے اعزازات سے نوازا جا چکا ہے۔ بقول مسعود چوہدری صاحب گرجر دیش چیریٹ ایبل ٹرسٹ کی تشکیل کے شروع ہی سے محمد یوسف ٹینگ صاحب کی صحبتِ نیک، ہمارے فکر کو کشادگی، نظر کو بالیدگی اور عزم کو قوت دیتی رہی۔ یہ سچ ہے کہ اس پامال گرجر قوم کے تئیں انکا مخلصانہ تعاون بے بدل ہے۔

"گوجر شناخت کا سفر"

بے شک یہ نہایت اہم مضمون ہے ۔گوجر منزل بمنزل کی زینت بن چکاہے۔اس کتاب میں اس مضمون پر کچھ بات کرناضروری سمجھتاہوں۔اس مضمون میں محمد یوسف ٹینگ نے گوجروں کے تابناک ماضی کی اور مہاجرت کی باتیں دہرائیں ہیں۔وہ لکھتے ہیں: تواریخ اور اسطور نے کہیں انکا وجود سکندراعظم سے کبھی شہنشاہ کنشک اور کبھی مہاراجہ مہر گل کے ساتھ جوڑاہے۔لیکن گوجروں کے ذہن پر انکے حال نے ایسابوجھ ڈالاہے کہ رسم آشنائی کے سارے رموز واسرار سے بیگانہ کردیا۔

گوجروں کے تواریخی سفر میں نور وظلمت کی عجب گھاٹیاں آتی ہیں۔اس میں کوہ قاف کا اسطوری پرستان بھی آتاہے اور بحیرہ خزر کادریائے شور بھی"۔

محمد یوسف ٹینگ نے پہلے تو گوجروں کا تابناک ماضی یاددلایاہے۔انہیں فولاد کی طرح گرم کر کے نئی شکل میں ڈھالنے کی کوشش کی ہے۔انہیں غیرت دلا کر موجودہ پامالی اور گراوٹ سے نکلنے کی ترغیب دی ہے۔ورنہ عظمت رفتہ کا تذکرہ کرنا، گوجروں کے تابناک ماضی کے نقارے بجانے کااس کے علاوہ کوئی مقصد ہونہیں سکتا۔

دنیاکادستور ہے ہر فاتح قوم مفتوح و مغلوب قوم کو جنگلوں کی طرف دھکیل دیتی رہی ہے۔یہی گوجروں کے ساتھ بھی ہوا۔انکے مراکز و املاک پر بیرونی حملہ آوروں نے قبضہ کرلیا۔انہیں گجرات اور راجستھان سے باہر نکلنے پر مجبور کیا۔وہ جہاں بھی گئے انہوں نے اپنا کلچر اور زبان نہین بھلائی۔

ٹینگ صاحب لکھتے ہیں۔

"گوجروں کے چہرے عام کشمیریوں کی نسبت ایک خاص انداز میں بڑے جاذب نظر آتے ہیں۔بلند اور کسی پہاڑی نالے کے پل کی طرح ستواں ناک، جھریوں سے بھری ابھری ہوئی پیشانی، مضبوط کاٹھی،بلند وبالاقد اور بناوسنگھار سے دور داڑھی۔ گوجر کسی دوسری دنیا کی مخلوق معلوم ہوتے ہیں۔اور پھر انکے میلے کچیلے کپڑے،بڑے انفرادی قسم کے لباس،خاص کر انکی پگڑیاں۔

دن کے اجالے میں گوجر شہر اور قصبوں میں دودھ کہیں گھی، کہیں پٹو، کہیں لکڑی،اور کہیں اون کی سوغاتیں لیئے ہوئے،،، لیکن جوں ہی سورج ڈوب گیالیکن جوں ہی سورج غائب ہوجاتا ہے گوجر نہ معلوم کیسے غائب ہوجاتا اور کہیں پاتال میں سماجاتاہے۔اجالے سے تعاقب اور اندھیرے میں پناہ دراصل گوجروں کے تاریخی سفر کاایک استعارہ ہے۔"

اس میں کوئی شک نہیں بزرگوں اور صوفیوں اور ولیوں کو اس قبیلے سے خاص نسبت رہی ہے۔یہی وجہہ ہے انہوں نے اپنی آرام گاہیں، قرار گاہیں، چلہ گاہیں، تکیے وغیرہ بنانے کے لئے جنگلوں کے گہرے سائے اور ڈھلوانوں کے سینے منتخب کئے جو گورجروں کی گزر گاہ اور مامن تھے۔خدا کوسادگی پسند ہے اسی لئے اس طائفہ میں کثرت سے فقراءواولیاء کا ظہور ہوا۔لیکن قدرتی ذخائر میں کمی کی وجہہ سے انکی روایتی زندگی مجروح ہوئی ہے۔اور بدلتے وقت کے ساتھ انہیں بدلناہی پڑے گا۔انہیں بال بچے کی تعداد کم کرنے کے لئے منصوبہ بندی کی اشد ضرورت ہے اور بال بچے کی پڑھائی

میں ہی انکی فلاح و بہتری ہے۔ انکے قائدین کو انکا استحصال کرنے کے بجائے انہیں صاف اور سچی بات بتانی چاہیئے۔

چراغوں کو ہاتھوں میں محفوظ رکھنا
بڑی دور تک رات ہی رات ہو گی

پدھم شری بلراج پوری:

بلراج پوری ۱۹۲۸ء میں جموں میں پیدا ہوئے حقوق انسانی کے ترجمان اور صحافت کے آسمان تھے۔۲۰۰۵ء میں پدم بھشن اوارڈ سے نوازے گئے،انہوں نے گوجروں کی ترقی وخوشحالی کے لئے کئی مضامین لکھے ہیں۔وہ لکھتے ہیں:

گوجروں کے نشاۃ الثانیہ کی تحریک کے سلسلہ میں دانشور مسعود احمد چودھری کی رفاقت و نگرانی میں گرجر دیش چیریٹ ایبل ٹرسٹ کی یادگار کارکردگی نمایاں پیش رفت ہے۔ اس خزانوں سے بھرے صندوق جس میں قومی سماجی ورثے اور نوادرات ہیں کے تحفظ وبقا کی سعی کی گئی ہے اور تعلیم کے شعبے میں بھی اہم خدمات سرانجام دینے کا آغاز کیا ہے۔

ستی ساہنی جموں کے ممتاز صحافی

جموں کے عظیم صحافی تھے ۱۹۲۲ میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۴۸میں ٹائمز آف انڈیا کے کارسپانڈٹ بنے چار جنگوں میں اخباری نمائیندے رہے بڑااعزاز ہے انہوں

نے فوٹو جرنلزم مین مثال قائم کی ۔ ڈائریکٹر جنرل آف انفارمیشن رہے۔۱۸ اکتوبر ۲۰۱۰ کو اس دارفانی سے چل بسے ،اس عظیم قلمکار نے جب قلم اٹھایا تو ہر طبقہ کی نمائیندگی کی ۔ گوجروں پر مہربان تھے اپنے قلم سے بہت عطا کر گئے ایک مقام پر انگلش مضمون میں لکھتے ہیں۔

"یہ لوگ قدیمی مآب روایتوں کے پاسدار ہیں۔انکاماضی بے داغ وسفید،سادہ وسیدھااور وفادارانہ طرز کا ہے۔"

یہ لوگ گنوار اور کوتہ نظر نہیں کسی علاقائی کشمکش کے دعوے دار نہیں، اور طفیلی و مزاحمتی بھی نہیں۔

انہوں نے کسی سرحد تک خود کو محدود نہیں رکھا۔ نہ کسی سرحد کو توڑا ہے مگر انکی ایک زبان گوجری نے انہیں رشتہء وحدت میں پرو رکھا ہے۔یہ مشقت کے عادی صنعتی سوچ اور صنعت کار ہیں(یعنی دودھ مکھن دہی پیدا کرنوالے) انکا موروث عظیم ہے لیکن محدود سہولتیں میسر ہوسکیں۔

انکی موسیقی اور لوک ورثے کی اپنی چاشنی ہے۔لیکن انکا لکھا ہوئی کوئی ادب ہے ہی نہیں۔

یہ لوگ خود بھوکے افلاس کی سطح سے نیچے رہ کر دوسروں کی مرغوب غذائیں،دودھ،مکھن،گوشت اور اون پیدا کرتے ہیں۔یہ لوگ گوجر ہیں۔"

باب سوئم

گورجروں اور بکروالوں کامختصر تاریخی پس منظر

سرزمین ہند پر اقوام عالم کے فراق
قافلے آتے گئے اور ہندوستان بنتا گیا

گورجروں کے آباء کی داستانیں بھی کم نہیں۔ بعض مورکوں کے مطابق وہ جارجیا کے باشندے تھے۔ وہ ریوڑ ہانکتے ہوئے، کہاں سے ہندوستان کی سر زمین پر وارد ہوئے۔ دوسری روایات کے مطابق وہ شروع ہی سے یہاں کے باشندے تھے۔ وہ کچھ بھی ہوں لیکن سچی بات یہ ہے کہ ماضی میں وہ کبھی اپنے مستقل کو علمی اور سائنسی بنیادوں پر نہیں اٹھا سکے۔ انہیں سیاسی مخالفت کی بنا پر بارہا نقل مکانی کرنا پڑی۔ شہروں کو چھوڑ کر جنگلوں میں جانا پڑا۔ جسکا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ معاشی طعر پر پسماندہ ہوگئے۔ یہ لوگ اجڈ قسم کی ناخواندہ و نیم خانہ بدوش قوم بن کر رہ گئی تھی۔ کہیں کہیں اسکی بعض گوتیں مکمل خانہ بدوشوں تھیں جیسے بن گورجر (بنیہارا) اور بکروال۔ اور آج بھی انکی حالت ناگفتہ بہ ہے۔ لاہیوال سب سے پسماندہ قوم ہے یہ لوگ اب بھی قدیم طرز کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ نہ زمانہ کو انکی پرواہے اور نہ ہی انکو زمانہ کی۔

گوجروں کی اپنی زبان ہے ۔ماضی میں انکا رتحریری ادب نہیں تھا۔ یہی کچھ لوگ گیت، قصے، کہانیاں جو سینہ بہ سینہ اور گوش بہ گوش منتقل ہوتا رہتا تھا۔ بعض ناقدین کا خیال ہے کہ انکی وحدت کی آخری مضبوط کھونٹی گوجری بولی ہے۔ لیکن یہ بات بھی سچ ہے کہ گورجر گوجری کے علاوہ راجستھانی، مراٹھی ،پنجابی ،ہندی اور اردو بلکہ خیبر پختون کے گورجر گوجری کے علاوہ پشتو بھی بولتے ہیں۔

یہ لوگ مذاہب بھی کئی رکھتے ہیں ۔مثلاً ہندو ، مسلمان ،سکھ ، عیسائی ، قادیانی، بہائی وغیرہ جموں کے مشہور گوجر سروری کسانہ کے رشتہ دار عیسائی ہیں۔ اسی طرح معروف گوجری اسکالر مرحوم ڈاکٹر صابر آفاقی اور انکے خویش و اقارب بہائی مذہب سے وابستہ ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ عہد وُسطیٰ میں مرکز راجستھان کا ابو پہاڑ تھا۔ جودھ پور ،میوات ہریانہ پ، پنجاب ، مدھیہ پردیش، جموں وکشمیر وقت کے ساتھ انہوں نے کئی جگہوں کو اپنے نام سے موسوم کیا ۔ مثلاً گجرات، گوجراں والا، گوجر خان ،وغیرہ۔ دی پیوپل آف انڈیا: آرکیالوجیکل سروے آف انڈیا کے مصنف کے مطابق:

"گورجر جانی پہچانی قوم ہے جو کشمیر سے لے کر گجرات اور مہارشٹر تک پھیلے ہوئے ہیں ۔ گجرات کی ریاست ان سے ،منسوب و معنون ہے۔ انہوں نے اپنے کارہائے نمایاں کی بدولت راجپوت صفوں میں بطور " بڑگجر " اپنی حیثیت کا لوہا منوایا۔ آجکل یہ فقط قبائلی وصحرائی بودوباش رکھنے پر مجبور ہیں۔" (ترجمہ از راقم)

برطانوی عہد میں گورجر
مشاہیر گورجر

آپ کی نظروں میں سورج کی ہے عظمت
ہم چراغوں کا بھی اتنا ہی ادب کرتے ہیں

برطانوی عہد میں اٹھارویں صدی کے روہیلہ نواب نجیب الدولہ مشہور گورجر سردار ہوئے ہیں۔ ان کے علاوہ دادری کے درگاہی سنگھ جو کہ ایک سو تینتیس گاوں

کے گوجر سردار تھے اور انگریزوں کو ۲۹ ہزار روپیہ مالیہ دیتے تھے۔ نین سنگھ گوجر بھی مشہور سردار تھے۔ ۱۸۵۷ء کے غدر میں چندر ولی کے گوجروں نے دمر سنگھ کی قیادت میں انگریزوں کے خلاف اعلان جنگ کیا۔ ان کے تین ہزار سپاہیوں پر مشتمل فوج نے انگریزوں سے ایمنیوشن اور گولہ بارود چھین لیا۔ دلی میں نہ صرف میٹکافے ہاوس پر قبضہ کیا۔ بلکہ اسکا ریکاڑد بھی ضبط کرلیا۔ بعد میں تولا رام راؤ جو کہ انگریز نواز تھا انگریزوں سے مل گیا، گرفتار ہونیوالے بیس نامی گجروں کا سر اڑدیا گیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ انگریزوں نے بھی مغلوں اور دیگر بادشاہوں کی طرح گورجروں کو "ٹربیولینٹ" قوموں میں سرفہرست رکھا تھا۔

گورجر شخصیات:

ریاست و حکومت بر صغیر میں گورجر سیاسی میدان میں بھی کسی سے پیچھے نہیں بھارت پاک میں سیاسی رہنماوں کے یہ نام کون نہیں جانتا سردار ولبھ بائی پٹیل ،پاکستان کے سابقہ صدر فضل الہی چودھری اور بھارتیہ سابق راشٹر پتی فخر الدین علی احمد ، اور اجیش پائلٹ جیسے متحرک اور فعال گوجر بھی ہوئے ہیں۔ راجیش پائلٹ کا اصلی نام راجیشوری پرشاد بدھوری تھا انکے صاحب زادے سچن پائلٹ کسی تعارف کے محتاج نہیں۔

چودھری رحمت اللہ

پاکستان کا نام تجویز کرنیوالے مخلص سیاست دان چودھری رحمت اللہ تھے جنہیں پاکستانی قوم " خالق لفظ پاکستان " اور نقاش پاکستان " کے نام سے یاد کرتی

ہے۔ ہوشیار پور علاقہ کے گاوں موہراں کے رہنے والے تھے۔ اخبار کشمیر گیزیٹ سے منسلک رہے۔ ۲۹ جنوری ۱۹۵۱ء کو یہ محسن پاکستان کسمپرسی کی حالت میں کیمبرج برطانیہ میں وفات پاگیا۔

۱۷ انکی لاوارث نعش کو ۱۵ روز تک کولد اسٹوریج میں رکھنے کے بعد ۲۰ فروری ۱۹۵۱ء کو دو مصری طلبہ نے امانتا دفنادیا۔ کوئی ہم وطن ،کوئی ہم عقیدہ ،کوئی سیاست دان اس عظیم شخص کو دفنانے کے لئے نہ گیا۔ بلکہ حق تو یہ ہے کہ ہوس کی ماری ہوئی قوم وزارتوں منصبوں، کلیموں کے چکر میں سرگرداں تھی۔ ۲۰۰ پونڈ کا قرضہ جو رحمت علی کے نام واجب الادا تھا بھی کسی نے ادانہ کیا۔ امانتا آج بھی انکی نعش ابھی وہیں وہاں بطور امانت دفن ہے۔

(کاروان شوق از حکیم آفتاب قرشی اور تحریک پاکستان کا ایک مظلوم اور عظیم رہنما از نذیر تبسم گورسی)

فوجی خدمات

بھارت میں کئی اعلی فوجی آفیسر اور جرنیل ہوئے ہیں۔ کروڑی سنگھ بھینسلا جو آجکل راجستھان میں گوجروں کی ریزرویشن کی تحریک کے المبردار ہیں مشہور ہیں۔ کمل رام مشہور فوجی جرنیل تھے جنہوں نے برٹش انڈیا کا سب سے بڑا گیلینٹری اوارڈ یعنی وکٹوریہ کر حاصل کیا تھا۔ ہماری ریاست سے برگیڈئر خدابخش مشہور فوجی کمانڈر تھے۔ انہوں نے جموں وکشمیر میں بے مثال کارہائے نمایاں سرانجام دئے تھے۔ جموں کا کے بی اسکول انہی کے نام سے معنون ہے۔

تحریک آزاادی

راؤ کدم سنگھ نے انڈین ریبلز آف ۱۸۵۷ء کی قیادت میں مثالی کارنامہ سر انجام دیا تھا۔ انکی بہادری کی مثال دی جاتی تھی۔ دھن سنگھ گورجر میرٹ کے کوتوال تھے بریٹش انڈیا کمپنی کے خلاف محاذ بنا کر اعلان جنگ کیا۔ ارجن سنگھ گورجر رام چندر وکیل وغیرہ ممتاز گورجر لیڈر رتھے۔

کچھ بات ہے کہ ہستی مٹتی نہیں ہماری
صدیوں رہاہے دشمن دور زماں ہمارا

شروع شروع میں مغربی حملہ آوروں نے انکے عظیم اتحاد کو پاش پاش کر دیا۔ اسکے مقامی مسلمان باشاہوں نے بھی اس قوم کو دبانے کی کوشش کی۔ علائالدین خلجی نے بھی انہیں اجڈ کہا۔ کیونکہ گورجر مزاحمتی قوم تھی مغلوں اور انگریزوں نے بھی اس قوم کو اپنا دشمن سمجھ کر پامال کرنے کی کوشش کی۔ مجبور ہو کر انہوں نے جنگلوں کی راہ لی ۔مذہب بدلا تو بدلا مگر آسانی سے کسی کے آگے جھکے نہیں۔ انکی خود داری انکے لئے نئے نئے ماحول پیدا کرتی رہی ۔فلاکت و تنگی کے ماحول میں بھی انہوں نے بقا کے راستے پر سفر حیات جاری رکھا۔

ریاست جموں وکشمیر میں گوجر شخصیات

علم و عرفان

بابامیاں عبداللہ المعروف باباجی صاحب

گفتہ او گفتہ اللہ بود، گرچہ از حلقوم عبداللہ بود

بقول شخصے: صدیاں گزر گئیں عشاق حق کے ذکر آج یہ تاثیر ہے۔ نہیں معلوم ان کی پاک صورتوں اور صحبتوں کی گہرائیوں اور دلربائیوں کا کیاعالم ہو گا۔

باباجی ۱۸۶۳ء میں بمقام ہزارہ میاں فضل گل کے ہاں متولد ہوئے۔ چار برس کی عمر میں ہی سایہء پدری سے محروم ہوئے۔ آپکی والدہ بی بی مائی حلیمہ نے پرورش کی۔ ۱۸۹۲ء میں اپنے مرشد کی ہدایت پر کشمیر آئے۔ اسرار کبیری انکے ملفوظات کی مشہور کتاب ہے۔ بابا نگری وانگت لار میں مرجع خلائق ہوئے اور ۱۸ فروری ۱۹۲۶ء کو اس دار فانی سے کوچ کر گئے۔ لار وانگت میں انکے مرشد میاں نظام الدین کیانوی کا عرس ہر سال ۲۶ جیٹھ یعنی ۸ جون کو منایا جاتا ہے۔ یہ سلسلہ ۱۸۹۵ء سے بدستور چلتا آرہا ہے۔ جب کہ بابا عبداللہ لاروی کا عرس ہر سال پندرہ شعبان بمابق ۷ پھاگن منایا جاتا ہے۔ پونچھ راجوری سے ہزاروں لوگ اس عرس مین حاضری دیتے ہیں۔ باباجی نے ملفوظات نظامیہ ۱۳۴۰ ہجری میں تصنیف کی۔ اپنے وقت کے ماہر فن قاضی عزیزالدین جو راجہ پونچھ کے درباری کاتب وخطاط تھے نے ہی ان دونوں کتابوں کی خطاطی کر کے اپنی محبت کا حق ادا کیا تھا۔

پونچھ راجوری سمیت کشمیر میں مرد عارف نے توحید کے ڈنکے بجائے۔ انکا عارفانہ کلام بطرز پنجابی ہے

حضرت میاں نظام الدین

میاں نظام الدین، تارک الدنیا ولی اللہ حضرت باباعبداللہ کے جانشین معنوی تھے۔سیاست اور روحانیت دونوں میدانوں کے شہسوار تھے ۔ انکا حلقہ ارادت بہت وسیع تھا۔ میاں نظام الدین صاحب گورجروں کے پہلے عظیم لیڈر تھے اور انکے ترجمان بھی۔ اگرچہ وہ بظاہر کنگن لار میں رہتے تھے۔ لیکن انکے مریدین اور ارادتمند کی بڑی تعداد پونچھ راجوری کے گورجروں بلکہ پہاڑیوں پر مشتمل تھی۔ اسی لئے وہ سیاسی اعتبار سے بہت ہی باثر تھے۔

مہرالدین قمر راجوروی منشی فاضل لاہور

۱۹۰۱ء کو بمقام راجوری پیدا ہوئے۔ صوفی کامل ،عالم اجل داعی و مبلغ اور حریت پسند تھے ۔ڈوگرہ سامراج کے خلاف برسرپیکار رہے۔ باباعبداللہ لاروی کے مرید خاص تھے۔ اور میاں نظام الدین لاروی کے معتمد خاص و سیاسی مشیر بھی تھے ۔ گوجر جاٹ کانفرنس میں نمایاں رول ادا کیا۔ آخری ایام میں ایبٹ آباد چلے گئے۔ اعلی خطیب تھے اور مقرر۔ بقول چوہدری گلزار حسین انہوں نے گوجر جاٹ کانفرنس کے سلسلہ میں میان نظام الدین لاروی کو قائل کیا، اور اپنی شعلہ بیانی سے لوگوں کو متاثر کرکے تحریک کی جانب مائل کیا۔

سماجی خدمات

چودھری دیوان علی

گوجر جاٹ کانفرنس کے سلسلے میں راجوری کے گوجروں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ چودھری دیوان علی پیش پیش رہے۔ چودھری برہان علی نے تھانیداری کی نوکری چھوڑ کر عوامی خدمت کی۔ انہوں نے لوگوں کی مشکلات کے پیش نظر راجوری مین غلہ بینک کا قیام کیا۔ اسطرح سادہ لوح لوگ بیوپاریوں اور کھتریوں کے چنگل سے باہر نکالے انکا یہ عظیم کارنامہ تھا۔ حال ہی انکے صاحب زادے راجوری کے نامور سیاست دان چوہدری گلزار احمد نے قائد اعلی چوہدری دیوان علی کی حیات اور کارنامے پر مشتمل کتاب شائع کی ہے۔۱۹۴۶ء میں گورجر جاٹ کانفرنس کی ٹکٹ پر ریاسی درہال سے میرزا محمد حسین کے مد مقابل پرجا سبھا کا الیکشن لڑا۔ اس وقت مینڈھر سے چوہدری غلام حسین کو مینڈیٹ ملا تھا مگر دوونوں ہی کامیاب نہ ہوسکے تھے۔ میندھر سے سردار فتح محمد کریلوی کامیاب ہوئے تھے۔

مولوی احمد دین

شخصی راج کے دوران طبقاتی کشمکش عروج پر تھی۔ ہندو سماج کی طرح مسلمان حکمران خاندانوں کے لوگ بھی دوسرے لوگون کو حقیر سمجھتے تھے۔ اسی ایک مچال ملاحظہ کریں، بقول چوہدری گلزار احمد راجوروی، مولوی احمد دین راجوری کے ایک گاوں سیم سمیت اڈاریاں سے تعلق رکھتے تھے جب وہ لاہور سے تعلیم حاصل کرکے آئے اور لوگوں کو اخلاقی و دینی تعلیمات دینے لگے تو بعض لوگوں نے کہنا شروع کردیا دیکھو کیسا دور آیاہے کم ذات لوگ علمی باتیں کرنے لگے ہیں۔ایک دن مولوی احمد دین چارپائی پر بیٹھا تھا سامنے سے ایک نام نہاد اونچے خاندان کی عورت گزری۔ اور انہیں

چارپائی پر بیٹھے دیکھ کر سخت غصے میں آگئی۔ اور گالی گلوچ کرتی ہوئی چلی گئی یہ بات جنگلی آگ کی طرح پھیل گئی۔ کہ ایک کم ذات تصور کئے جانے والی برادری کا آدمی اونچے خاندان کی عورت کے سامنے چارپائی پر بیٹھا رہا۔ کچھ دن بعد عورت کے رشتہ داروں نے یہ کہتے ہوئے مولوی صاحب کی دھلائی کر دی کہ تم نے چارپائی پر بیٹھ کر ہماری برادری کی توہین کی ہے۔ اور یہ کہ تم نے کوئی تعلیم نہیں حاصل کی بلکہ تم تو پنجاب مزدوری کرنے گئے تھے۔ اشرافیہ طبقہ کے لوگوں نے احتجاجاً مولوی کے رشتہ دار کاشت کاروں کے حصہ مزدوری کا غلہ بھی بند کر دیا۔

اک پڑوسی کو پڑوسی آنکھ دکھلانے لگے
کیا کریں جب آدمی کو آدمی کھانے لگے

شخصی دور کی حکومت اور آپ راجی کے زمانے میں اس قسم کے واقعات عام ہو کرتے تھے۔ گورجر برادری سخت پامال تھی ہر زندگی کے ہر میداں میں ہر قدم پر انہیں روندا جاتا تھا۔ یہاں یہکہنا بے جانہ ہو گا کہ راجوری پونچھ میں جدید علم کا رجھا پہلے پہل کئی مولویوں نے ہی پھیلایا۔ پرانے اساتذے میں انکی کثرت تھی۔ ریاضی اور سائنس میں مقامی ہندو اساتذہ نے ہی پہلا مرحلہ طے کروایا۔ لہذا ہم ان اساتذہ کے ارواح کو سلام پیش کرتے ہیں۔

فیض حسین انقلاب

سن لو اے فرقہ پرستو! کان اپنے کھول کر
فیصلہ دوٹوک ہو گا تم نہیں یا ہم نہیں

(فیض حسین انقلاب)

بقول چوہدری گلزار حسین فیض حسین انقلاب لاہور میں کسی کمپنی میں مشتہر کا کام کرتے تھے۔ بلا کے مقرر تھے۔ راجوری میں واپس آکر انہوں نے لوگوں کو جدید تعلیم کے لئے آمادہ کیا اور نوجوانوں کو تربیت دی۔ وہ سماجی نظام میں نیا رجحان اور بدلاو کے حامی تھے۔ راجوری کے گوجروں کو بدلتے وقت کے ساتھ بدلنے اور جدید تعلیم حاصل کرنے کی ترغیب دی۔ چوہدری طالب حسین جو ان دنوں سوشل ویلفئر میں ملازم تھے کو نوکری چھوڑ کر ایل ایل بی کرنے پر آمادہ کیا۔ فیض خود بھی سوشل ویل آفیسر تھے۔ فیض حسین انقلاب نمبر بھی شایع ہو چکا ہے۔ چوہدری طالب حسین جیسے قد آور سیاست دان انکو اپنا منٹر سمجھتے ہیں۔ چوہدری طالب حسین واحد رہنما جو قلم کار بھی ہیں۔ انکے بصیرت افروز مضامین میری نظر سے گزرے ہیں۔

چودھری قیصر الدین قیصر

آپ کا تعلق اوڑی کے گوجر خاندان سے ہے۔ اس مخصوص قبیلہ سے ترقی پا کر بننے والے پہلے ڈپٹی کمشنر تھے۔ انجنئرینگ کالج کے دور میں ان سے ملاقات ہوئی تھی ان دنوں وہ بٹ مالو میں رہتے تھے۔ گوجر طالب علم کے مسائل کے حل میں رہبری کرتے تھے۔ ہمدرد اور خلیق شخصیت کے مالک ہیں در اصل بڑے خدا دوست اور شریف النفس،۔ انہوں نے گوجری میں کئی مضامین لکھے ہیں انکے ادبی نظریات سے متفق ہونا ضروری نہیں بہر حال انکا اردو نمونہ تحریر یوں ہے۔

قیصر الدین قیصر لکھتے ہیں کہ (ترقی پسند)ادب تخلیق کرنے کا اہم مقصد یہ بھی ہوتا ہے کہ وہ سماج کی عکاسی کرے اس کی عام نظروں سے پوشیدہ و خفیہ گوشوں میں پلنے والی اور پروان چڑھنے والی ہر برائی کو منظر عام پر لا کر سماج کی رائے عامہ کو ہموار کرے۔ سماج کے ضمیر کو بیدار کرے، تاکہ برائی یا خرابی کے خلاف انسانی نفرت کو منظم کیا جا سکے، اور برائی کے جنم داتا کو برائی کا راستہ ترک کرنے پر مجبور کیا سکے، پس ثابت ہوا کہ ادب محض سماج عکاس و ترجمان ہی نہیں نقاد و رہبر بھی ہے جو صحت مند نشانِ منزل کا پتہ بتا کر میدانِ عمل کی دعوت دیتا ہے۔ ماہنامہ آوازِ گُرجر جلد ا شمارہ ۲ جون ۱۹۹۵ء گرجر ریسرچ انسٹی ٹیوٹ جموں نے بڑے زور و شور سے آواز گرجر اخبار کا آغاز کیا لیکن اس اخبار کا زور شور پہاڑ سے گرتی ہوئی آبشار کی طرح برقرار نہ رہ سکا ہے۔ اسکے فکری منبع سوکھ گئے اور اسکی قسمت بھی وہی نکلی جو بھارت میں چھپنے والے اردو رسائل اور جرائد کی ہوتی ہے۔ چند ہی سالوں میں لوگ انکے نام اور چھاپنے والا کا نام بھی بھول جاتے ہیں۔

۱۹۶۰ء اور ۱۹۸۰ء کے درمیان ابھرنے والے گورجر لیڈر

میاں بشیر احمد لاروی

میاں بشیر احمد سیاست و روحانیت دونوں میدانوں کے شہسوار ہیں۔ انہوں نے میاں نظام الدین کی رسی کو مضبوطی سے پکڑا بلکہ اسے مزید فروغ بھی دیا۔ انہوں

نے اپنے سلسلہ کے کئی نوادرات کو محفوظ رکھا ہے۔ جن میں اورنگ زیب کے ہاتھوں کے لکھا ہوا قلمی نسخہ بھی شامل ہے۔ اسکے تاریخی مخطوطے اور نسخے بھی۔ معارف التبرکات میں ذکر کیا ہے۔ انہوں نے اپنے منفرد طریقے سے عوام کی زبردست خدمت کی۔ انکا حلقہ محض گوجروں تک محدود نہیں رہا بلکہ دوسری برادریوں کو بھی اپنے حلقہ میں شامل کیا۔ بقول شخصے میر زار شید جیسے دیدہ ورنہ صرف انکے معتقد تھے اور بلکہ ان کی مشاورت و رائے سے مستفیض ہوتے رہے۔ اگرچہ انکا تعلق کنگن لار سے ہے لیکن وہ خطہ ء پونچھ راجوری میں بھی از حد مقبول ہیں۔ انکی عوام دوستی ، ملکی و قومی خدمات امن و امان پسندی کی بنا پر بھارتیہ سرکار نے انہیں پدم شری کا اعزاز دیا ہے۔ ریاست کے گوجروں میں وہ یہ اعزاز پانے والے پہلے شخص ہیں۔

چودھری عبدالغنی چھجلہ والے

پیدائشی لیڈر تھے وسیع المشرب اور سچے محبِ وطن تھے۔ انکی وطن دوستی کی بدولت بھارت بھر میں گوجروں کو عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ انہوں نے مینڈھر میں اندرا گاندھی کو مدعو کیا اور تاریخی استقبال کیا۔ مینڈھر میں سیکڑوں ڈھول باجے شادیانے بج رہے تھے۔ جب محترمہ اندرا گاندھی نے کہا، چودھری صاحب بس بھی کرو اب یہ شور شرابہ۔۔ لیکن چودھری عبدالغنی مست البیلے کب رکنے والے تھے انہوں نے کہا آج کے دن یہ ڈھول باجے بند نہیں کئے جائیں گے اندرا گاندھی اپنے کانوں میں انگلیاں ٹھونستے ہوئے مسکرا کر خاموش ہو گئیں۔ یہ ڈھول باجے کا سلسلہ چلتا

رہا۔ چودھری صاحب اکھل بھارتیہ گورجر مہاسبھا جو ۱۹۰۸ میں قائم کی گئی تھے کے آل انڈیا لیول پر چھٹے پریزڈنٹ ہوئے۔ ریاست جموں وکشمیر کے پہلے شخص تھے جنہوں نے ۱۹۷۷ تا ۱۹۸۲ء اس بڑی غیر سیاسی وفلاحی تنظیم کی صدارت اور سربراہی کی۔

حاجی بلند خان گلاب گڑھی

گورجر ایڈوائزری بورڈ کے چیئر مین رہے وزیر برائے زراعت بھی۔ ۱۹۳۳ء میں گول گلاب گڑھ میں پیدا ہوئے۔ انکی سیاست کسی کی مرہون منت نہیں۔ نہ تو انہوں نے کسی سیاسی خانوادے کا سہارا لیا اور نہ ہی کسی دوسری سیاسی یا پیروں کی گدی کی پناہ لی۔ چوہدری محمد حسین آف درہال کی طرح انہوں نے اپنی خداداد دانش اور فکر کو بروئے کار لا کر لوگوں کی خدمت کی اور مضبوط بنیادیں ڈالنے میں کامیاب ہوئے۔ علاقے کی گورجروں کے مقبول ترین لیڈر سمجھے گئے۔ نام بلند خان تھا قدو قامت کے اعتبار سے بھی اور مقام کے اعتبار سے بھی تا دیر بلندیوں پر جگمگاتے رہے۔ چودھری اعجاز خان لیجیسلیٹر اور سابقہ منتری انکے صاحب زادے ہیں۔ ۷ جون ۲۰۰۷ میں رحلت فرما گئے۔ حق مغفرت کرے۔

چودھری محمد حسین درہالوی

ترالا گوجرا گاؤں تحصیل بدھل کے رہنے والے تھے۔ پڑھے لکھے اعلی سوچ رکھتے تھے۔ انکی سیاست بھی جداگانہ طرز کی تھی۔ درہال سے متعدد بار ایم ایل منتخب ہوئے۔ انکاے اوصاف کا ذکر اوپر بھی ہو چکا ہے۔ پہلے لیڈر تھے جنہوں نے تازندگی

کوئی مالیت یا ایسیٹ نہیں بنائے۔ تا حیات لوگوں کی مشکلات کے ازالہ میں مصروف رہے۔ ان کی قائم کی گئی سیاسی روایت کو انکے صاحب زادے چودھری ذولفقار جو اس وقت کیبینٹ منسٹر ہمہ تن مصروف ہیں اور عوام کی خدمت میں کمر بستہ ہیں۔ چوہدری محمد حسین اور مقبول احمد رضا جو چوہدری گلزار حسین کے بھتیجے تھے دونوں پڑھے پہلے گورجر لکھے نوجوان تھے یہی دو گورجر نوجوان بخشی غلام محمد کی سرکار میں تعینات کئے جانے والے پہلے راجوری سے پہلے گوجر آفیسر تھے۔ چوہدری مقبول احمد بعد میں پاکستان چلے گئے وہاں ڈپٹی کمشنر اعلیٰ عہدے سے سبکدوش ہوئے۔

ادب و تاریخ

عبدالغنی الشاشی الازہری

گرسائی مینڈھر کے رہنے والے ہیں۔ پھر وہاب نگر شار کشمیر منتقل ہو گئے۔ کشمیر میں دینی خدمات کے لئے جانے جاتے ہیں بین القوامی درجہ کے عالم دین ہیں ۔بیرون ریاست کئی اداروں کے سرپرست اعلی ہیں۔ جامعہ ازہر سے اعلی تعلیم، پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ ۱۹۷۳ء کشمیر یونیورسٹی میں شعبہء عربی سے منسلک ہوئے۔ کئی تاریخی کتابوں مثلاً گوجر قوم گوجر اور گوجر (دو جلدوں میں) اور گوجر تاریخ و ثقافت ' ضیاء البیان " کے مصنف ہیں ۔ انہوں نے کئی مقالے بھی لکھے۔ مشرق وسطی میں گوجر قوم کے اثرات مین رقمطراز ہیں: گوجر خانہ بدوش قبائل اور عرب کے بدوی قبائل کی طرز معاش، تہذیب شکل، رہن سہن کے طریقے آج بھی آپس میں بہت ملتے جلتے ہیں۔ اس لئے یہ مانا جاسکتا ہے کہ سامی قبائل کے بچے کھچے خاندان اپنے ریوڑ اور

پالتو جانور کوہ قاف کی طرف نکلے ہوں اور وہی گرجی بعد میں گوجر کہلاتے ہیں"۔ یہ لوگ گورجیا کی نسبت سے گوجر کہلانے لگے۔ گوجر عرب اصل اور افغانی ہی ہو سکتے ہیں ۔افغان ترانوں میں انکا ذکر ہوا ہے۔ پانچویں سطر ملاحظہ کریں:

این کشور افغانستان است، این عزت ہر افغان است
خانہ صلح، خانہء شمشیر، ہر فروزندیش قہرمان است
این کشور خانہ ہمہ است، از بلوچ ازبک
از پختون وہزارہ، از ترکمن و تاجک
ہم عرب وگوجر است، پامیریہا، نورستانیہا
میگو ییم اللہ اکبر ،میگو ییم اللہ اکبر

الشاشی صاحب ابھی بقیدِ حیات ہیں جید عالم ہیں اور عظیم صوفی اور عارف باللہ بھی۔ الشافعی مسلک رکھتے ہیں اور کئی دینی اداروں کے سربارہ بھی ہیں۔ انکی تحقیق کے مطابق کھٹانہ قبیلہ گوتیانہ، ماہر ، مہرہ، ہکلا، ہیک سوس، گورسی غروسیان، چیچی، چچین، جاگل جنگل یا جیکل، کسانہ کاشان، بجران باجوران، پھامڑہ، فامیان کٹاریہ ،بنو قتور بجاڑ ،بیجار یاباذر، بلہسر بلاذر، کھوکھر، خوسور، بوکڑا بوقن وغیرہ نہایت دلچسپ کتاب ہے اور انکی تحقیق غیر معمولی اور غیر روایتی انداز کی ہے۔ گھنے درختوں کے سائے کی عمر لمبی ہو

ڈاکٹر صابر آفاقی

۱۹۳۳ء میں مظفر آباد کے گوہاڑی غاوں میں چوہدری علی محمد کے گھر پیدا ہوئے۔ ۱۹۶۹ تا ۱۹۷۲ تہران سے فارسی میں پی ایچ ڈی کی۔ پروفیسر تعینات ہوئے

شاعری و تاریخ پر گہری نظر رکھتے تھے ۲۰۰۷ء میں میری ملاقات ہوئی تھی۔ اور سرنکوٹ میں انہیں سننے کا موقع بھی ملا۔ عکسِ کشمیر پر تو کشمیر بھارت کے سفر کے دوران لکھ کر چھوڑ گئے۔ تاریخ کشمیر بھی انہیں کی تالیف کی گئی ایک کتاب ہے گوجری گرامر پر کچھ کام کیا ہے گلہائے کشمیر بھی انہیں کی تصنیف لطیف ہے۔ بہائی مسلک رکھتے تھے۔

مخلص وجدانی

برادر صابر آفاقی ہیں۔ گوجری اور اردو کے شاعر ہیں۔ گوجری کو جدید آہنگ سے ہمکنار کرنے والے پہلے شاعر ہیں۔ لیکن انکی شاعری میں قنوطیت اور یاس وحرمان چھایا ہوا ہے افلاس وکسمپرسی کے شکوے جابجا کئے ہیں۔ عزم وحوصلہ اور ولولہ انگیزی کی کمی کے باوجود پُر تاثیر اشعار کہنے کی صلاحیت لائق تحسین ہے۔

مسافت عمر بھر کی تھی سفر اپنا مسلسل تھا
قدم لیکن وہیں ہے آج بھی اپنا جہاں کل تھا

محمد اسمعیل ذبیح

۱۹۱۱ء کو راجوری میں پیدا ہوئے۔ عربی اور فارسی کے زبان دان بھی، نالہء دل، یاد وطن، آثار، گلدستہ ذبیح اور انتظار وغیرہ کئی کتابیں تصنیف کیں۔ انکا اردو شعر مشہور ہے۔ گوجری میں انکے ابیات مشہور ہیں۔

الف اللہ غوواسطو جارے قاصد، میرا یار ناں میرو پیغام دے آ
کہنو رکھنو یاد پر دسییاں ناں، قسم، واسطو رب غونام دے آ
میری روح تے جان دلگیر طرفوں، بنھ غے ہتھ سلام کلام دے آ

ذبیح یارناں اک حقیر تحفو، میری زندگی عمر تمام دے آ

حال ہی ذبیح صاحب کی کتاب انتظار ملی۔ پڑھ کر معلوم ہوا کہ ان کے کئی مقامی شعراء سے قلمی روابط تھے، ہاڑی کے معروف شاعر چوہدری حسن دین حسن اور چوہدری دیوان علی کے خطوط انہوں نے اپنی کتاب می ں شام کروائے تھے، کتاب کا پیش لفظ ڈاکٹر صابر آفاقی کا لکھا ہوا ہے۔ یہاں نے کئی دوسرے بزرگ شعراء گوجری کا ذکر بھی کرنا تھا۔ حاجی خدا بخش زار کے کلام کی چاشنی اور سائیں فقر دین کے کلام کی روحانیت کا ذکر بھی رہ گیا ہے۔

چودھری فتح علی سروری کسانہ محسن گوجری

۱۹۳۷ء کو چوہدری شکر دین ساکنہ موعالی جموں میں پیدا ہوئے۔ انہیں نے گوجروں کو منظم کرنے میں زبردست رول ادا کیا۔ وہ "گوجر دیس" اخبار بھی نکالتے رہے۔ انکے ایک مضمون کی سرخی یاد آتی ہے "گوجر جاٹ اہیرااور راجپوت: نسلی ایکتا خون کے رشتے وغیرہ مضامین خوب لکھے ہیں۔ گوجروں کی گوتوں کا گیان رکھتے تھے۔ لڑکپن کے دور میں، میں نے انہیں اور پروفیسر رام پرشاد کھٹانہ کو جموں میں دیکھا تھا۔ انکا وہ چھریرہ بدن اور فکر میں ڈوبی ہوئی شخصیت کا دھندلا عکس ابھی تک دل سے مٹا نہیں۔

گئے دنوں کا سراغ لیکر کہاں سے آیا کدھر گیا وہ
عجیب مانوس اجنبی تھا مجھے تو حیران کر گیا وہ

چوہدری گلزار احمد

آپ راجوری دھنور کے رہنے والے ہیں۔ ۱۹۳۱ء میں چودھری دیوان علی راجوری کے سرکردہ اور مقتدر گوجروں میں سے ایک تھے کے گھر پیدا ہوئے۔ میٹرک کے بعد لاہور سے تعلیم حاصل کی۔ ۱۹۴۷ء میں ہجرت کر کے اپنے والد کے ساتھ کھوئی رٹہ کوٹلی چلے گئے تھے۔ ۱۹۶۱ء میں واپس راجوری چلے آئے۔ ۱۹۴۸ تا ۱۹۵۳ کشمیر تراڑ ریڈیو میں پہاڑی پروگرام کے پروڈیوسر رہے۔ ۱۹۶۱ء تا ۱۹۶۷ء بخشی غلام محمد کے دور میں ریاستی قانون ساز اسمبلی کے ممبر رہے۔ سیاسی حوالے سے معروف نام ہے ابھی بقید حیات ہیں۔ چوہدری گلزار احمد نے گوجروں کے شیڈیول ٹرائب کے معاملہ میں کافی مثبت رول ادا کیا۔ وہ کئی وفود لے کر دلی جاتے رہے۔ حال ہی میں انہوں نے انکشاف کیا کہ اگر ہماری برادری کے پرانۓ وضع کے گوجر لیڈر گوجروں کے حق میں شیڈیول ٹرائب اسٹیٹس کی مخالفت نہ کرتے تو یہ مسئلہ ۱۹۷۵ء میں ہی حل ہو جاتا۔ اس بات کی تائید چوہدری مسعود صاحب نے بھی کی۔ ہمارے اپنے ہی قدسمت پسند لیڈروں کی مخالفت سے یہ مسئلہ ۱۹۸۹ء تک تعطل کا شکار رہا۔ انہوں نے بتایا کہ چند شیکھر وزیر اعظم کو جب انہوں نے ونوبھا بھاوا کے گوجروں کے بارہ میں دئے گئے۔ تاثرات پیش کئے تو وہ جھوم اٹھے۔ ونوبھاوا ۱۹۵۶ء میں بھودان تحریک کے سلسلے میں جموں آئے تھے یہاں کے گوجروں نے لکھن پور میں انکا استقبال کیا۔ چوہدری احمد سرپنچ بھٹنڈی نے ایک "لائیری گائے" اور بکری کئی دنوں تک انکے کاروان کے ساتھ رکھی۔ کئی دن کی پدیاترا میں وہ خود بھی ساتھ رہا۔ ونوبھا بھاوے انکے سلوک سے سخت

متاثر ہوئے۔ بلا آخر ونو بھا بھاوا جی نے انہیں راجوری سے زبردستی واپس کیا۔ کشمیر سے واپسی گجرات جاکر اس عظیم شخص نے اپنے سفر نامہ میں لکھا:

" بھارت سرکار جموں وکشمیر میں جو کچھ بیج بو رہی ہے وہاں کاٹنے کو کچھ بھی نہیں۔ وہاں صرف ایک طبقہ آباد ہے جس نے کرشن کو بھی ماکھن دودھ کھلایا پلایا اور مجھے بھی" طبقہ سے مراد گوجر طبقہ ہے۔

رانا فضل حسین

۱۹۲۱ء راجوری پروڑی میں فیض محمد ٹینچ کے گھر پیدا ہوئے۔ میٹرک پاس کرنے کے بعد تجارت پیشہ اختیار کیا ملکی تقسیم کے بعد مقبوضہ کشمیر پاکستان چلے گئے اور تراڑکھل ریڈیو سے منسلک ہوگئے۔"بانیچل بانیچل پانی " انکا گوجری شعری مجموعہ ہے۔ ہتھ کنکن، کہانیں، بچھڑی کونج اڈار مثنوی گوجری شاعری، لہو پھوار شاعری، دل داغ داغ وغیرہ کتابوں کے مصنف ہیں۔ میاں بشیر احمد لاروی کے خلیفہ ہیں۔ انکے گیتوں کی مقبولیت کی وجہہ سے بعض لوگ انہیں گوجری گیتوں کی مقبولیت کی وجہہ سے بعض لوگ انہیں بابائے گوجری کہتے ہیں۔ لیکن ڈاکٹر صابر آفاقی نے اس کی سختی سے تردید کی ہے۔ بہر حال ہجر کے آوامیں پکا پکایا گھڑے پر تھاپ جیسا من موہنے والا کلام سننے کے لائق ہے۔

کائے گل امڑی کی دس گھڑیا۔ فِر پانی بھرتاں ہس گھڑیا
اُت ٹھنڈی چھاں وے تھی، اُت میری پیاری ماں وے تھی

تھی نال اُسے کے چَس گھڑیا۔۔۔
فِر مُڑ مُڑ بولے کا گارے، کوئی درد پھرولے کا گارے
کچھ لوڑے کاں کاں کوکے، پڑھ منتر کیوں نہ پھوکے
من میرو ڈولے کا گارے۔
تیں مار اڈاری جانوں تھے رے، کوئی دورں نال لیانوں تھے رے
توں بولے ہووے کوئی آوے تھو، آ میرا درد ونڈاوے تھو
کوئی اکھوں اوہلے کا گارے، فِر مُڑ مُڑ بولے کا گارے

مسعود چودھری کی شخصیت اور خدمات

مصدر فیض

ظلمتوں کے سائے میں پلتے رہے اطفال نور
پتھروں کے شہر میں ہوتی رہی شیشہ گری

کالابن مرتفع، اور عمودی ڈھلوان قسم کا علاقہ ہے۔جہاں بستیوں کے ارد گرد کالے ریٹھوں کے جنگل بکثرت ہیں۔ان ریٹھوں کے تنے سیاہ کالے ہیں اور ریٹھوں کے جنگل میں دن کے وقت بھی روشنی کی بجائے سیاہی ہی برستی ہے اسی نسبت سے پورے علاقہ کو کالابن کہا جاتا ہے۔بحر ظلمات میں ہی آب حیات کا سراغ چھپا ہوا ہے کے مترادف یہاں کے لوگوں کے نے حیرت انگیز طور پر ترقی کی۔ یہاں سے علم و دانش کے وہ سوتے پھوٹے جو اپنی مثال آپ ہیں

مصدر فیض سے میری مراد الحاج چوہدری فیض احمد المعروف بابو فیض احمد صاحب ہیں بابو فیض احمد اسی مرتفع و بلند کہستانی علاقے کے ساکن تھے۔جو بلند چوٹیوں کی طرح سب سے پہلے چڑھتے اور ڈوبتے ہوئے سورج کی پہلی اور آخری کرنوں کے ساتھ ساتھ گورجر قوم کا اقبال وادبار بھی ملاحظہ کرتے رہے۔مرحوم بابو فیض احمد اس وقت کے عام پڑھے لکھے لوگوں سے کہیں کہیں زیادہ سوجھ بوجھ رکھتے تھے۔وہ انیسوی صدی میں علی گڑھ کی علمی سرگرمیوں سے آگاہ تھے اور اپنی پسماندہ اور پچھڑی ہوئی قوم کی زبوں حالی کی چارہ جوئی کے لئے کوشاں تھے۔اور سمجھتے تھے کہ علومِ

جدیدہ کے علاوہ اس قوم کی حالتِ سو کا کوئی چارہ و علاج نہیں۔لیکن انکا دائرہ اثر بہت محدود تھا۔

بابو فیض احمد صاحب ایک نہایت متین و مدبر شخصیت کے مالک تھے۔کم گو حلیم مزاج ہمیشہ گہری سوچ میں ڈوبے رہتے تھے۔میں خود بھی کئی بار ان سے ملا ہوں وہ بلند اخلاق تھے ملتے وقت خفیف سے مسکراہٹ سے اجنبی شخص کا بھی حوصلہ بڑھا دیتے تھے۔مسعود احمد چوہدری کی والدہ ماجدہ بھی بھی سلیقہ شعار اور باوقار خاتون تھیں۔یہ دونوں وجیہہ بزرگ بہت سے لوگوں کے لئے کحلِ بصارت تھے۔

برصغیر کے دو پھاڑ ہو چکے تھے افراتفری کا ماحول تھا۔ آزادی کے خواب کی تعبیر لاکھوں جسموں کی فصل کے کٹنے کی صورت میں دیکھی جا چکی تھی۔طرح طرح کی مہمیں چل رہی تھیں۔یہ وہ دور تھا۔جب کسی منصوبہ کے تحت بابو فیض احمد اپنے دو بچوں سمیت نقل مکانی کر کے عباس پور چلے گئے یہ مہاجرت پُراسرار تھی۔پتہ نہیں وہ کون سے گورجر دیس کے خوابوں کو اپنے ساتھ لئے تھے۔۔یہ کہانی پھر سہی۔

بہت کم بار ایسا ہوتا ہے کہ غربت کی سطح کے نیچے اور دور دراز پہاڑوں میں سے کہیں کوئی امید افزا روشنی کی کرن پھوٹتی ہے اور پھر وہ تائید ازلی سے اپنے اوجِ کمال پر پہنچ جاتی ہے۔

دس مارچ ۱۹۴۴ء کو ایک ایسی ہی روشنی کی کرن موضع کالابن مینڈھر کے پہاڑی اور کٹے پھٹے پہاڑی علاقے سے پھوٹی اور جلد ہی اپنی علاقائی حدود پھلانک کر اس کی روشنی دوسرے اضلاع تک ہی نہیں محدود رہی بلکہ پوری ریاست کے ایک دبے کچلے

ہوئے طبقہ کے نوجوانوں کے لئے دم کشی و روحانی فیضان کی صورت اختیار کر گئی۔بے شک انکی فضیلت کی شہادت مخالفین واعداء نے بھی دی۔شعر

نہ پکڑی قافلے کی جس نے انگلی وہ بچہ سب سے آگے چل رہا تھا

والد ماجد کو اس پسماندہ قوم کے لئے مثال اعلی اپنے ہی ماحول سے پیدا کرنا تھی۔ آپ کا خانوادہ سادگی اور شرافت کے باعث معزز تھا اور اپنی تہذیبی اور معاشرتی اقتدار کا پاسدار بھی۔ مسعود چوہدری کی سرشت میں اپنے باپ کا ورثہ اور انکا پس منظر، چاہے آرمی جیسا نظم وضبط ہو یا تعلیمی چلن ہو، اوصاف چھلکتے نظر آتے ہیں۔

اس کے لہجے میں قیامت کی فسوں کاری تھی
لوگ آواز کی لذت میں گرفتار ملے

عباس پور سے علی گڑھ تک کا سفر زندگی

مسعود احمد چوہدری تین چار سال تک ہائی اسکول بانڈی عباس پور میں زیرِ تعلیم رہے۔ وہاں سے پھر نامساعد و غیر ساز گار حالات نے انکے خاندان کو اپنے گاوں کالابن منتقل ہونے پر مجبور کیا۔

مسعود چوہدری کا بود و باش پہاڑی علاقہ تھا جہاں بنیادی سہولیات مثلاً پانی بجلی اور سڑک وغیرہ بھی میسر نہیں تھی۔ انہیں روزانہ پانچ کلومیٹر دشوار گزار راستہ طے پڑتا تھا اور اسی طرح اسکول سے واپسی پر بھوکے پیٹ اتنا ہی سفر طے کر گھر پہنچنا پڑتا تھا۔ان دنوں گاوں میں روشنی کے لئے لوگ دینیاں یعنی ریزن والی لکڑیوں کے ٹکڑے جلا کر پڑھتے تھے۔اور رات کو باہر جانا ہوتا یا کسی کے گھر تو ٹارچ کی بجائے مورا یا مُٹھا

جلا کر ہاتھ میں لینا پڑتا تھا لیکن موصوف کے والد ملازم سرکار تھے اور ایک اچھے استاد ،اس لئے انکے گھر میں مٹی کے تیل سے جلنے والی چمنی مہیا تھی اور لالٹین بھی۔انہیں چاندنی رات میں چاند کے چڑھنے کی انتظار نہ کرنا پڑتی تھی۔انہوں نے ان سہولیات کا بھرپور فائدہ اٹھایا۔

جب وہ پونچھ ہائی اسکول میں داخل ہوئے تو وہ ہوسٹل میں ہی ٹھہرتے تھے ۔ہفتے دو ہفتے کے بعد پیدل ایک طرفہ پندرہ بیس کلومیٹر سفر کر کے ہی کالابن مینڈر پہنچتے تھے۔ان کے راستے میں دشوار گزار پہاڑی راستے کے علاوہ جنگل بھی پڑھتا تھا۔ انہیں اپنے گاوں کالابن سے کسبلاڑی کی ٹاپ پر پہنچ کر کے کھنّتر یا کلائی کے راستے پونچھ پہنچنا پڑتا تھا۔اور آنا بھی اسی راستے پڑتا تھ دوسرے متبادل راستے کالابن سے شاہستار سے سنئی یا سرنکوٹ تک پیدل چل کر بس کے ذریعہ پونچھ پہنچنا پڑتا تھا۔پونچھ ہائی اسکول اور کالج کے کئی اساتذہ کا ذکر خیر کرتے رہتے ہیں۔جن میں غلام محی الدین بے۔اے۔بی۔ٹی ماسٹر لبھورام راجندر سنگھ اشوک وردھن کیول کرشن کپور محمد دین بانڈے دیناناتھ رفیق وغیرہ۔کے نام پیش پیش ہیں۔

انہوں نے ہائی اسکول پونچھ سے میٹرک کا امتحان پاس کیا اور پھر ایم اے ایم کالج جموں سے بی اے پاس کرنے کے بعد مسعود احمد چوہدری نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے ۱۹٦٦ء میں درجہ ء امتیازی کے ساتھ ایل ایل بی کی ڈگری حاصل کی ۔۔ علی گڑھ میں اس دور میں بدرالدین طیب جی جیسی مایہ ناز شخصیت وائس چانسلر تھے اور انکے بعد علی یاور جنگ۔

اس وقت کی حکومت کے سربراہ جناب خواجہ غلام محمد صادق نے جو پچھڑے ہوئے علاقوں کو اپنی نگاہِ التفات میں رکھتے تھے۔ انہیں نے مسعود چودھری کو ہاتھوں ہاتھ پولیس سروس میں لے لیا۔ انکا یہ مطمہء نظر تھا کہ پچھڑے ہوئے علاقوں اور پچھڑی ہوئی قوموں کی ترقی و بہبود کا راز، انہیں اقوام کے پڑھے لکھے افراد کی سعی میں مضمر ہے۔ چنانچہ مسعود چوہدری کو مارچ ۱۹۶۷ء میں ڈی ایس پی کے عہدے پر تائینات کیا گیا اور سنتیس سالہ شاندار کیریئر کے دوران وہ ترقی کرتے کرتے مختلف عہدہ جات پر رہے، ۲۰۰۴ بلا آخر ایڈیشنل ڈائریکٹر جنرل آف پولیس کے عہدہ عالی سے سبکدوش ہوئے۔

سرشت میں نسلی وطبقاتی رنگ کی آمیزش

مسعود چودھری کے بچپن کے بارہ میں محترم لطیف فیضی نے بتایا کہ وہ دونوں عباس پور مقبوضہ کشمیر پاکستان میں پرائمری کلاس میں زیر تعلیم تھے۔ مسعود چودھری کے والد جو کہ ہمارے اسکول میں مدرس تھے ایک دن چھٹی پر تھے۔ مسعود چودھری نے انکا اخبار گجر گیزیٹ ہاتھ میں لیا ہوا گھر جا رہے تھے۔ تو کچھ راجپوت بچوں نے جو وہاں بکثرت تھے۔ مل کر مسعود چودھری کی ہنسی اڑائی۔ اور انکے ہاتھ سے چھین کر اخبار کا پرچہ بھی پھاڑ ڈالا ۔ اور بقول فیضی صاحب مسعود چودھری اور میں چھوٹے

تھے۔ مسعود چودھری ڈر گئے اور روتے روتے گھر پہنچے۔ انکے والد ماجد نے پوچھا بیٹے کیا ہوا۔ تمہیں کیا کسی نے پیٹا ہے؟ مسعود چودھری کہتے ہیں میں نے والد سے کہا۔ اگر انہوں نے مجھے پیٹا ہوتا تو شاید میں نہیں روتا۔ لیکن انہوں نے مجھے گندے گندے الفاظ کہے اور میر امذاق اڑایا ہے۔ اور اخبار پھاڑ ڈالا۔

لطیف فیضی جو کہ ایک تعلیمی ادارے کے پرنسپل رہ کر سبکدوش ہوئے ہیں کہتے ہیں مینڈھر میں طویل عرصے کے بعد ایک معزز سیاسی شخص سے میری ملاقات ہوئی۔ تو اس نے پوچھا :"عباس پور وچ اجاں وی گوجری چلنی اے" یعنی عباس پور میں آج بھی گوجری چلتی ہے۔ فیضی صاحب کہتے ہیں میں نے کہا،"جی ہاں گوجری ہمارا اچھا ایمان ہے"

اس ضمن میں جب مسعود چوہدری سے بات کی گئی تو انہوں نے اس واقعہ کی نہ صرف تائید کی بلکہ مزید کہا: ہم کسی زبان سے نفرت نہیں کرتے تو پھر دوسرے لوگ کیوں ہماری زبان اور ہم سے نفرت کرتے ہیں؟ یہ حق انہیں کس نے دیا ہے؟ مسعود چودھری کہتے ہیں کہ ہمارے کشمیری بھائی دفتروں میں بھی دوسرے کشمیری سے کشمیری زبان میں بات کرنا فخر سمجھتے ہیں اسی طرح ڈوگرے بھی ڈوگری اپنے مقامات پر ڈوگری میں بات کر روٹھے ہوئے صنم کو منا لیتے ہیں لیکن گوجر کو گوجر سے بات کرتے ہوئے بھی برداشت نہیں کیا جاتا۔

کیا کسی کے پاس اس سوال کا جواب ہے؟ نہیں ہزار بار نہیں۔ یہ مقامِ غور ہے۔ گوجری زبان دوسری مقامی زبانوں سے اور گوجر لوگ کسی بھی طرح دوسرے

لوگوں سے کم نہیں۔ شکل وصورت، حسن وجمال، قد کاٹھ، البتہ پڑھائی میں ہم گوجر لوگ کشمیری ڈوگروں اور سکھوں سے پیچھے ہیں۔ اور بہت سے کنبے ابھی تک بے گھر ہیں انکی آباد کاری کے مسائل جوں کے توں ہیں۔ وہ ابھی بھی ماٹو پر اپنی پشتینی دستاویز حاصل کرتے ہیں۔ خانہ بدوش لوگ کسمپرسی کے عالم میں زندگی کے دن گزار رہے ہیں۔

مسعود چودھری کہتے: " مجھے گوجروں سے بلا امتیاز مذہب ازلی محبت ہے۔ میرے لئے راجستھان کا گوجر بھی پونچھ کے گوجر ہی جیسا محترم ہے"۔

وہ کہتے ہیں۔ مذہب اپنے اپنے ہیں میں گوجروں کے عشق میں کبھی کسی غیر گوجر سے نا انصافی نہیں کی۔ نہ کسی کا حق مارا ہے بلکہ میرے پاس جو بھی آیا ہے میں نے اس کا کام استحاق اور قابلیت کی بنیاد پر کیا ہے۔ البتہ چار آدمی میرٹ پر لگانے کے بعد میں پانچواں فرد اپنی قوم کا بھی منتخب کرنے کی کوشش کی ۔ کئی لوگوں کو روزگار فراہم کی۔ میں نے کسی حق نہیں مارا۔ مجھے اپنے کئے پر کوئی افسوس نہیں۔ کیونکہ اپنے ضمیر کے مطابق سچا ہوں۔ اگر مجھے زندگی میں کہیں کوئی اور موقع بھی مل جائے۔ وہ ہنس کر کہہ رہے اگر مجھے بالفرض زلیخا کی طرح دوسری جوانی بھی مل جائے تو بھی میں دوبارہ ایسا ہی کروں گا ۔ میں نے کوئی غلطی نہیں کی اور نہ ہی مجھے اپنے کئے پر کوئی ندامت محسوس ہو رہی ہے۔

میں نے دیکھا ہے کہ گوجر برادری کے معاملے پر بات کرتے ہوئے مسعود چودھری جذباتی ہو جاتے ہیں۔ انکی آواز میں شیر جیسی گرج پیدا ہو جاتی ہے، وہ جسم اینٹھنے لگتے

ہیں شاید میں نے زندگی میں ان سے بڑا جذباتی گجر آج تک نہیں دیکھا۔ انکے جزبات کے پیچھے کئی پرانے زخم ہیں۔ تلخ یادیں اور سلوک ناروا کے قصے۔

شیخ محمد عبداللہ نے اپنی آپ بیتی میں جو نقوش جلد دوم صفحہ ۹۰۵ پر لکھتے ہیں۔ یہاں یہ واقعہ نقل کرنا بے جانہ ہوگا۔

میں کشمیری تھا اور میرے ہم وطن بھائی پنجاب میں گدھوں سے زیادہ محنت کر کے پیٹ پالتے تھے۔ ان کی وجہہ سے میرے ہم جماعت پنجابی لڑکے مجھ پر آوازے کستے تھے۔ مجھ پر طعن زنی کرتے اور مجھے ہنسی کے طور پر " ہتو" کہہ پکارتے۔ میں بے اختیار تھا۔ اپنے ہم وطنوں کی مظلومیت پر پر خون بہانے کے سوا اور کیا کر سکتا تھا۔ میرے پنجابی دوستوں کا مذاق مجھ پر بجلیاں گراتا تھا مجھے اپنے وطن عزیز سے اور زیادہ محبت ہوگئی۔ میں مظلوم قوم کا فرد تھا ایک مظلوم قوم کے لئے اسکا وطن ہی بہترین جائے پناہ ہے۔

اس میں شک میں نہیں لاہور میں پڑھائی کے دوران مرحوم شیخ عبداللہ کو پنجابی مسلمان لڑکے "ہتو" کرکے بلاتے تھے اور تنگ کرتے تھے۔ اس منافرت کی ایک جھلک پاکستان کے مشہور بیوروکریٹ کی تحرروں سے ظاہر ہے۔

قدرت اللہ شہاب نے اپنی مشہور کتاب شہاب نامہ جسے عام اور جاہل لوگ ایک ولی کامل کے انکشافات سمجھتے ہیں۔ در اصل ایک افسانوی طرز کی کتاب ہے۔ قدرت اللہ شہاب کتاب مذکورہ کے صفحہ ۱۱۰ پر لکھتے ہیں:

"شیخ صاحب ڈیڑھ اینٹ کا مندر الگ بنا کر مہاتما گاندھی اور پنڈت نہرو کے قدموں میں جا بیٹھے۔ شیخ عبداللہ کے کباڑ خانے میں بے پیندے کا لوٹا تھا۔ مسلم کانفرنس سے ناطہ توڑ کر شیخ صاحب نے نیشنل کانفرنس کی بنیاد ڈالی تو پہلے اس کے استرے سے اپنی خوبصورت داڑھی کا صفایا کیا اور پھر اس قضیہء کشمیر کی خشت اول بھی رکھ دی جو آج تک پاکستان اور بھارت کے درمیان ایک خطرناک ناسور کی طرح رِس رِس کر بہہ رہا ہے۔ شیخ عبداللہ کی سیاست پلاسٹی سین کی ہم صفت تھی ان کے بھارتی آقا جب چاہیں انہیں توڑ مروڑ کر اپنی مرضی کا پتلا بنا لیتے تھے" جب کہ شیخ محمد عبداللہ کے حامیوں کا کہنا ہے۔

مسئلہ الحاق وقت کی نزاکت تھی اور کشمیریت کو بچانے کی ایک تدبیر

مسعود چوہدری نے ایک انٹرویو کے دوران بتایا کہ وہ بچپن میں اسکول کے دور میں ستائے گئے۔ ان کو انکی ذات کی بنیاد پر انہیں کوسا گیا۔ اسکے اثرات یہ مرتب ہوئے کہ مسعود چوہدری نے ایک مہم چلائی اور گوجروں کے حقوق کی آواز کو بلند کیا۔ ان میں تعلیم کو فروغ دیا۔ اس اعتبار سے انکی یہ شدت مثبت انداز اختیار کر گئی۔ انہوں نے کسی کی حق تلفی کئے بغیر گوجروں کو انکے حقوق دلانے کے لئے زبردست عملی اقدامات کئے۔

ویسے بھی قانون قدرت کے مطابق ہر بڑے انسان میں بھی جہاں کئی محاسن ہوتے ہیں ان کے علاوہ کچھ ایک یا کوئی نہ کوئی نقص یا عیب بھی ہوتا ہے۔ بقول شری رتن رینا (آئی پی ایس) مسعود چوہدری کو بھی اس قانون قدرت سے مستثنیٰ نہیں سمجھا

سکتا ہے۔ رینہ صاحب کہتے ہیں کہ ایک بار کا واقعہ ہے کہ ایک تلک دھاری والا موٹا پہلوان نما آدمی انکے دفتر میں آیا اور مسعود صاحب نے کئی آفیسرز کو اس کی خدمت میں کمربستہ کھڑا کر رکھا تھا۔ وہ سبھی آفیسر اس تلک دھاری کے آگے پیچھے پھر رہے تھے مسٹر رینا کہتے ہیں کہ میں نے پوچھا کہ یہ کون شخص ہے؟ جس کی اتنی آو بھگت کی اور کروائی جارہی ہے اور جسے وی آئی پی سلوک دیا جارہا ہے۔۔ مسعود چوہدری نے کہا: اوہ ہی از اے گجر فرام راجستھان☆یعنی "اوہ وہ ایک راجستھانی گجر ہے"۔

خدا کی قدرت ہے لہلہائیں انہیں میں فصلیں
جو کھیت پٹواریوں نے بنجر لکھے ہوئے تھے

مسعود چودھری کہتے ہیں کہ میں نے گوجروں کے استحصال کے خلاف یہ آواز ڈگری کالج پونچھ میں اٹھائی تھی۔ جب کوئی میری زبان میں بات نہیں کرتا تو میں اسکی زبان میں بات کیوں کروں۔ میں سمجھتا ہوں دوسری علاقائی بولیاں کسی بھی طرح گوجری سے افضل اور بہتر نہیں۔ پونچھ کالج میں پروفیسر سردار بچن سنگھ جی نے ایک بار مجھے گوجری میں بات کرتے ہوئے ٹوکا اور کہا"، مسعود توں گجر دا گجر ای رہیا ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ "مسعود تو گوجر کا گوجر ہی رہا ہے"۔

مسعود چودھری کہتے ہیں کہ اس وقت مجھ سے رہا نہیں گیا اور اس بات کے عینی گواہ مینڈھر منکوٹ کے سید محمد وردی بھی ہیں۔ جو ابھی بقید حیات ہیں۔ میں نے کہا" گوجری فقط میری ماں بولی نہیں بلکہ ایک مہان زبان ہے۔ سندھی گجراتی راجستھانی میں اسکے اثرات دیکھیں۔ قدیم ہندی یا ہندوستانی کو دیکھیں۔ یہ حق حاصل

نہیں کہ آپ کسی بھی کسی دوسری زبان سے کم قرار دیں۔ اسکی اپنی لوک روایتیں، کہانیاں ہیں قصے محاورے اور مقولے بھی" ۔۔۔خیر سردار جی ہکا بکا رہ گئے۔مسعود صاحب نے کہاسندھی لوگ گیت کے بول دیکھیں عشق غوروگ اوکھو"۔

واقعہ مسعود چودھری نے بتایا کہ ایک وقت لوگ گوجری میں بات کرتے ہوئے کتراتے تھے۔ محفلوں جلسوں میں پڑھے لکھے لوگ گوجری لباس اور پگڑی پہننا شرم سمجھتے تھے ۱۹۹۲ء کے بعد میں نے اس عملی تدابیریں کی اس کے حوصلہ افزا نتائج حاصل ہوئے۔ٹرسٹ کے سلسلے میں پیش ہونے وفود اور نمائیندوں کو پگڑی اور گوجری لباس پہنے کی ترغیب دی۔یہ تلقین کامیاب ہوئی ۔ اس کے بعد ہماری دیکھا دیکھی دوسرے گورجر سیاسی لوگوں نے بھی اس رسم کو اپنایا۔اس طرح گوجری زبان میں لوگوں نے بات کرنا شروع کی اور گوجری لباس کو لوگوں نے پہننا فخر سمجھا۔مسعود صاحب نے ایک معزز گوجر لیڈر کا واقعہ سنایا۔جو ابھی بقید حیات ہیں کہتے ہیں کہ ایک بار میں نے انہیں فون کیا تو انہوں نے پہاڑی میں کہا: مسعود جی کے حال اے تساں ناں ؟یعنی۔مسعود جی کیا حال ہے آپکا؟مسعود صاحب کہتے ہیں کہ میں نے کہا: "میں تے گوجری ماں گل کی تھی تھارے کول کوئی پہاڑی تے نہیں بیٹھووی" یعنی میں نے تو گوجری میں بات کی تھی آپ کے پاس کوئی پہاڑی تو نہیں بیٹھا ہوا" اسکے بعد اس صاحب نے کہا۔

میں تُساں غی بعد وچ فون کرساں" یعنی میں آپ سے تھوڑی دیر بعد بات کروں گا۔

بے سائیگی نے ہم کو بنایا ہے تیز گام
ہم لوگ سوکھے پیڑوں کے احسان مند ہیں

مسعود صاحب کہتے ہیں یہ کا حال تھا ہماری برادری کے اچھے کھاتے پیتے لیڈروں کا۔وہ بھی گوجری میں بات کرنے میں شرم محسوس کرتے تھے وہ کہتے ہیں کہ پونچھ راجوری کے گوجر لیڈروں کو گوجری میں بات کرتے ہوئے کم ہی دیکھا ہے۔البتہ چودھری محمد اسلم صاحب اور انکے والد محترم ہمیشہ گوجری میں بات کرتے تھے۔میاں بشیر احمد لاروی بھی ہمیشہ گوجری میں بات کیا کرتے ہیں۔

مزید مسعود چودھری کا کہنا ہے کہ کنور رامیشور سنگھ صاحب جو میرے سینئر پولیس آفیسر ہی نہیں بلکہ میرے محسن و مربی بھی تھے ایک بار مجھ سے کہنے لگے:

مسعود تیرے خلاف بڑی شکایتاں ہین"۔یعنی مسعود تمہارے بارے میں کئی شکایتیں ہیں۔

میں نے پوچھا کیا شکایتیں ہیں میرے خلاف۔جناب

وہ ہنس کر کہنے لگے:

مسعود توں پڑھے لکھے گجراں نال وی گوجری وچ گلاں کرداہیں یعنی تو پڑھے لکھے لوگوں سے بھی گوجری میں بات کرتا ہے۔

مسعود چوہدری کا یہی جواب تھا کہ اس میں کوئی برائی نہیں۔میں اگر اپنے بھائیوں کو اپنی ماں بولی میں بات کرکے انہیں احساس کمتری سے باہر نکالوں تو اس میں کسی کو کوئی اعتراض نہیں ہونا چاہئے۔کیونکہ میری مادری زبان کسی دوسری زبان سے کم نہیں

۔میرے لئے وہ ویسی ہی مقدس ہے جیسی کسی دوسرے شخص کے لئے اس کی اپنی ماں بولی۔

بعض اہل ثروت گوجر حضرات جو گھروں میں آج کل گوجری بولی کے بجائے پنجابی بولنا پسند کرتے ہیں اس ضمن میں انہوں نے جموں اور راجوری کے مقتدر گوجروں کے نام بھی گنوائے۔ جو میں اس کتاب میں شامل نہیں کر رہا۔

مسعود چودھری کا کہنا ہے کہ ہر دور میں پڑھے لکھے گوجر موجود تھے۔ ہندوستان کے متعلق البیرونی کا مقولہ مشہور ہے۔

یہاں گوبر کو تھاپ کر بنائے گئے اپلے اور ہیرے جواہرات کے ڈھیر کو ایک ساتھ رکھا جاتا ہے ۔ آج بھی اچھے اور برے ہمدرد اور خود غرض کی پہچان نہیں کی جاتی۔

پرانے دور میں گوجروں میں اچھے اور پڑھے لکھے انسان موجود تھے لیکن انکی کوئی تاریخ نہیں مرتب ہو سکی۔ مثال کے طور پر اوجین کا راجہ بھوج سب سے پڑھا لکھا راجہ تھا۔ آج بھی جسکی مثل مشہور ہے۔ کہاں راجہ بھوج اور کہاں گنگو تیلی گوجر راجاوں (بلاامتیازِ مذہب وملت) پرانی تاریخ اٹھا کر دیکھیں کہ علاولدین خلجی کے وقت میں جب یہ کہہ کر گجروں کا استحصال کیا جاتا۔' گوجر سے اجڑ بہتر اجڑ سے جاڑ " ان ناانصافیوں کے خلاف ایک بہادر گوجر جس کا نام ظفر خان گجر تھا نے بغاوت کی اور پہلی گوجر سلطنت قائم کی۔ وہ کہتے ہیں۔

اسی طرح گوجروں میں بڑے بڑے عارف بڑے بڑے نڈر اور بہادر قسم کے لوگ پیدا ہوئے ہیں۔ اگر کہیں کسی ایک جگہ کوئی گجر دھن سنگھ تھا تو دوسری جگہ وہ منگل حسین تھا۔ لیکن بہادری اور شجاعت دونوں کی مشترکہ صفت تھی۔

ہیں میری انگلیاں خود اپنے لہو میں ڈوبی
یہ کانچ کے ٹکڑوں کو اٹھانے کی سزا ہے

پولیس میں منفرد کارکردگیاں:

محکمہ پولیس میں میں مسعود چوہدری کو انکی حسن کارکردگی کی بنا پر بھارت سرکار نے ۱۹۸۳-۱۹۸۲ء میں پولیس میڈل فار میریٹوریس سروس دیام۔ مقررہ معیاد سے پہلے کسی کم عمر آفیسر کو ملنے والا شاید یہ اعزاز سب سے ان ہی کو ملا پہلا تھا۔

یہاں یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ مسعود چوہدری کو قدرت کاملہ نے بے حد اختراعی اور اعلٰی تجددانہ صلاحیتوں سے نوازا ہوا ہے وہ بد سے بدتر اور بگڑے ہوئے حالات میں بھی مثبت تبدیلی لا دیتے تھے۔ اس امتیازی وصف نے انہیں اپنے پورے کیرائر کے دوران سرفررز رکھا۔ خمیر و سرشت کے مطابق مسعود چوہدری کبھی بھی آپے سے باہر نہیں ہوتے وہ خوبی کے ساتھ ، بوجھل ہونے کی حالت میں بھی ٹھنڈے رہتے ہیں۔ تحمل مزاجی اور دور اندیشی کی وجہ سے وہ ہمیشہ کامیاب و فائز المرام ہوئے۔
جب وہ پہلی ایس پی پونچھ بنے تو انہوں نے پولیس کا مورال بلند کیا انسداد جرائم و نفاذ

قوانین قائم کرنے کے علاوہ پولیس اسٹاف کی رہائشی انتظامات کو بہتر بنایا لنگر کے نظام میں ترمیم کر کے زیادہ تسلی بخش بنایا اسی طرح انکی وردیوں اور چھوٹے چھوٹے دیگر متعلقہ مسائل کا تسلی بخش حل بھی کیا۔

پونچھ اور دیگر اضلاع میں مسعود چودھری نے کمنیوٹی پولیسینگ کو فروغ دیا پولیس عوام دوستی کے ثمرات عوام تک براہ راست پہنچائے۔ اپنی نیک نیتی اور قابلیت کی بدولت ہر جگہ کامیابی حاصل کی۔ روایتی نظام کو چابکدستی سے فعال بنایا اور تھانگی نظام کو مستحکم کیا۔

ہریالی پروگرام " اوپریشن گلستان " کا آغاز کیا۔ وتحفظ ماحولیات کے سلسلہ کی ایک کڑی تھا انہوں نے دوسرے محکموں کی مدد لے کر ہر تھانے میں پانی بجلی اور سڑک کو بہتر بنوایا محکمہ فلوریکلچر سے رابطہ کر کے ہر تھانے میں پھول لگوائے۔

یہی وجہہ تھی کہ اس وقت کے ڈائیر کٹر جنرل آف پولیس پیر غلام حسن شاہ صاحب نے جب سبھی اضلاع کے بعد پونچھ ضلع کا دورہ کیا تو انہوں نے ضلع پونچھ کو "ویل ایڈمنسٹرڈ ضلع " قرار دیا اور ڈی جی پی صاحب بہادر نے اپنی انسپکشن رپورٹ میں ہدایت دی اور یہ حکم صادر فرمایا کہ سبھی اضلاع اپنا معیار پونچھ ضلع کے مطابق بنائیں گے۔ یہ اعزاز کوئی کم نہ تھا۔ بلکہ باعث صد فخر تھا۔

مسعود چودھری کئ مختلف اضلاع میں تعیناتی کے دوران بدنام زمانہ چوروں ڈاکوؤں اور سمگلروں کا ناک میں دم کر کے عوام کو راحت پہنچائی۔

۱۹۹۰ میں میں میلی ٹنسی یکایک آتش فشان پہاڑ کی طرح پھوٹ چکی تھی۔ سرینگر میں حالات کافی خراب تھے دن رات فائرنگ جابجا گرنیڈ حملے کئے جارہے تھے۔ مسعود احمد چوہدری کو جموں ویجلنس سے اٹھا کر سرینگر اسی دہکتے آوے میں جھونک دیا گیا۔ انہوں نے وہاں مثالی کام کیا۔ لیکن اب کی بار بھی انہوں نے اعلیٰ کارکردگی دکھائی، ان کے خوبصورت ٹریک ریکارڈ اوراعلی کارکردگی کی بنیاد پر ۱۹۹۴-۱۹۹۵ء میں بھارت سرکار نے 'پریزیڈنٹ پولیس میڈل فار ڈسٹنگیوشڈ سروسیز " عطا کیا۔ اسطرح انکا نام ریاستی پولیس کے چند انگلیوں پر گنے چنے ممتاز آفیسروں میں آتا تھا۔

۱۹۹۸ء میں مسعود چودھری کو پولیس اکیڈمی کا بنیاد گزار ڈائیر کٹر بنایا گیا۔ انہوں نے اپنی خداداد صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر شیر کشمیر ادھمپور پولیس ٹریننگ کالج کو اپ گریڈ کروا کر اکادمی کے رتبہ دلوایا۔ انکی اس ممتاز و نمایاں کارکردگی، کے اظہار، خلوص نیت و قوت اردی کے باعث آنے والے دور میں انہیں مزید بڑی زمہ دار میاں سونپی گئیں۔

وہ کہتے ہیں کہ مین خوش قسمت تھا کہ مجھے غیر معمولی تیز طبع اور روشن مزاج اساتذہ کے ماتحت اپنے ہی ڈھنگ کے مطابق کام کرنے کا موقع ملا۔ ان اساتذہ کی پدرانہ شفقت اور مربیانہ سلوک نے مسعود چوہدری کے کیریر کو فعال بنانے اور انکی صلاحیتیں کو بروئے کارلانے میں جاگ یعنی خامرے (کیٹالِسٹ) ہی جیسی عمل انگیزی کا کام کیا۔ مسعود چوہدری کہتے ہیں کہ وہ اپنے عظیم اساتذہ یا پھر مربیان میں سابقہ ڈائریکٹر جنرل آف پولیس کا نام اکثر لیتے رہتے ہیں۔ پیر غلام حسن شاہ، غلام جیلانی پنڈت، اور مہیندر

ناتھ سبر وال جی۔ ان کے علاوہ وہ آنجہانی کنور رامیشور سنگھ کو بھی اپنا کامل استاد سمجھتے ہیں ۔ بقول مسعود چودھری اان ہی اساتذہ سے انہوں نے محکمہ پولیس اور ایڈ مینسٹریشن کے بارہ بہت کچھ سیکھا۔

انہوں نے اپنے سروس کیریر کے دوران ویجیلنس آرگنائزیشن میں تقریبا دس سال مختلف عہدوں پر کام کیا۔ وہ ریاست کے پانچ اضلاع کے ضلعی پولیس ہیڈ بھی رہے۔ اپنی اعلی کارکردگی اور حسن سلوک سے انہوں نے ضلع پونچھ کٹھوعہ ادھم پور جموں اور سرینگر میں ااپنی کارکردگی کی دھاک بٹھائی۔

شکل وشمائل

گول چہرہ، شہابی رنگ، کشادہ اور گھنے ابرو، غیر صامت اور ہوشیار آنکھیں، دائیں رخسار پر دو تل گویا ترقیم وتاکید کی علامت ہیں۔ مطلب ہے مسعود چودھری کو وضاحت سے پڑھاجائے۔ باہوش ملاحظہ کیاجائے۔ انکی شخصیت کی کئی تہیں ہیں۔ اور پرتیں دیکھتے وقت انکی آنکھیں سیدھی مقابل پر جمی رہتی ہے۔ پہلی ہی نظر میں وہ مخالف کو سر سے پیر تک تول لیتے ہیں۔ کبھی کبھار انکی نظریں تنقیدی بھی ہوتی ہیں اور فتح مندی کے نشے سے چھلکتی ہوئی بھی محسوس ہوتی ہیں۔

جبین کی کشادگی اڑے ہوئے بالوں والے سر کے وسط میں جاملی ہے دیکھ کر فیض احمد فیض یا مغنی محمد رفیع کی یاد آجاتی ہے۔

چہرے پر مسرت اور شادمانی برستی ،رہتی ہے۔ ہنسی کے وقت وہ اپنے عائد کی گئی پابندیاں ہٹاکر بے تکلف بھی ہوجاتے ہیں۔ ناک بلند کے بجائے قدرے چھوٹی جس پر

موٹے شیشے والی عینک چڑھی رہتی ہے۔ گردن موٹی جسم سڈول قد درمیانہ کلائیوں پر لمبے اور گھنے بال،ان کے بازو جسم کے مطابق ومتناسب اگرچہ ذیادہ لمبے نہیں لیکن انہوں نے کئی قد آور لوگوں کے سروں پر اپناہاتھ پھیر کر کوتاہ قدی کا احساس دلایا۔ کئی غریب طالب علموں کو گلے لگایا انکی مالی معاونت کر کے اپنی فراخ دلی اور عالی ظرفی کا ثبوت دیا۔

ہتھیلیاں بھی پڑھے لکھے لوگوں کی طرح اتنی بڑی نہیں۔ بس واجبی جیسی ہیں لیکن لوگوں کو نرم نرم دستانے پہن کر فولادی گرفت سے پکڑ کر ساتھ چلانا انکا دستور تھا۔

مسعود چودھری کثیر الجہت شخصیت ہیں وہ بیک وقت تھری سٹار پولیس جرنیل بھی تھے۔ ایڈمنسٹیٹر بھی ادارہ ساز بھی بلکہ نظریہ ساز بھی۔ انکابڑاکارنامہ یہ تھا کہ انہوں نے پچھڑی ہوئی قوم گوجر کو خواب غفلت سے جگایا۔

ہم جانتے ہیں قبائل وشعوب کا مقصد پہچان ہے۔ یہ تو قاعدہ ربانی ہے۔ اس جزبہ کے تحت انہوں نے اپنی برادری اور قبیلے کے لوگوں کی صحیح معنوں میں رہنمائی کی اور حقیقی مشکل کشائی بھی۔ مشکل کشائی یہ نہیں کہ کسی جاں بہ لب شخص کو کسی موہوم یانامعلوم غیبی خزانے سے دو روٹیاں عنایت کردی جائیں بلکہ مشکل کشائی یہ ہے کہ کسی غریب فرد یابچے کو روزگار کمانے کی تعلیم سکھائی جائے۔ گداگری کے بجائے اسے خود اعتمادی سکھائی جاوے۔ اس لیے وہ شروع ہی سے گوجروں کی فلاح کے لئے خواب

بافیوں میں لگے رہے اور ۱۹۹۰ء کے آس پاس انہوں نے عملی اقدامات بھی شروع کیے انکی کاوشوں کے نتیجہ سے ہی گوجر دیش چیرٹ ایبل کا منصوبہ شرمندہ تعبیر ہوا۔

سر سید اور ڈاکٹر ذاکر حسین کے اثرات

دنیا میں ہر باوقار شخص کا کوئی نہ کوئی معنوی استاد ہوتا ہے۔ ہمارا پہلا استاد ہماری فیملی اور ماں ہوتی ہے اس کے بعد ماحول، اسکول، ادارے وغیرہ آتے ہیں۔ اسکے علاوہ کوئی بھی آدمی تب تک بڑا نہیں ہو سکتا جب وہ کسی بڑے آدمی یا اسکی تحریروں سے تربیت نہ حاصل کرے۔ ہمارے پڑھے لکھے افراد نے جن قائدین سے رہنمائی حاصل کی ہے ان میں سر سید احمد خان اور ڈاکٹر ذاکر حسین سر فہرست ہیں۔ اس لئے ہم اس کتاب میں انکے بارہ میں کچھ نہ کچھ ضرور لکھیں گے تاکہ لوگ ان سے استفادہ کر سکیں۔ اس کے علاوہ کچھ تحریکوں کا ذکر بھی کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔

بڑے لوگوں کی زندگیوں کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ وہ لوح تاریخ پر نمودار ہونے کے بعد ساکت تصویر کی طرح نہیں رہتے بلکہ وہ اپنے خدو خال پینٹ کرنے کے ساتھ اپنے زمانے کی بیک گراونڈ کے بین نشانات کو بھی اجاگر کرنے میں کامیاب ہوتے ہیں۔ وہ اپنے عہد کی پہچان بھی ہوتے ہیں۔ اور اس میں کار فرما بھی لیکن عام لوگوں کے تخمین و ظن کے خس و خاشاک انہیں اپنے قابو میں نہیں لاسکتے۔ اسی لئے سر سید کو انکے عہد کے لوگ اتنا نہیں سمجھ سکے جتنا کہ آج ہم لوگ انکا تحرک و تموج محسوس کرتے ہیں۔ عوام الناس ہمیشہ ظاہری اور وقتی چمک پر جان دیتے ہیں۔ وہ

نہیں جانتے کہ آگے چل کر ملمع کی عارضی چمک ماند پڑ جاتی ہے اور کھرے سونے کی پائداری بر قرار رہتی ہے۔

بہر حال وقت فرق بتا ہی دیتا ہے۔ بڑے لوگوں کے اثرات وفیوض انکی حیات کے بعد بھی جاری و ساری رہتے ہیں۔ علی گڑھ میں تعلیم کے درران مسعود احمد چودھری کو سر سید کی تحریک کا موقع ملا۔ کوئی شک نہیں۔

سر سید بدامنی اور انتشار کو قومی ترقی کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ سمجھتے تھے اور مسلمانان ہند کو اسی راہ پر چلنے کی تلقین دیتے تھے۔ اور چاہتے تھے کہ لوگ قومی وقار و عزت کو ذاتی ناموس و نام کی طرح سمجھیں۔ زندہ قوموں کی یہی روش ہوتی ہے۔ وہ ہمیشہ سوئی ہوئی قوم کو خواب غفلت سے بیدار کرنے کے درپئے رہے۔

ز شیخ شہر جان بردم بتذویر مسلمانی، مدارا گر باو کافر نمی کردم چہ می کردم

انکا خیال تھا کہ مسلمانان ہند کے پاس تلافی مات کا واحد علاج تحصیل و حصول علوم جدیدہ ہیں۔ نہ تشدد اور قدامت پرستی۔ وہ روایتی مذہب کے سخت خلاف تھے انہوں نے مذہب سے متعلق غلط فہمیوں کا بھی ازالہ کرنے کا مصمم ارداہ کیا تہذیب الاخلاق اسی سلسلے کی کڑی ہے۔ انہوں نے اپنی قوم کو خود اعتمادی و خود کفالت کی تعلیم دی۔

حقا کہ با عقوبت دوزخ برابر است
رفتن بپائےن مردی ہمسایہ در بہشت

یہ سچ ہے کہ مسلمانوں کو جدید تعلیم سیکھنے کی ترغیب سر سید ہی نے دی۔ لیکن آج بھی یہ قوم انکی بصیرت افروز باتوں کو سمجھنے سے قاصر ہے۔ جسکا نتیجہ عدم توازن قوت تعلیم یافتگان یاڈگری یافتگان کی صورت میں ظاہر ہوا۔

الغرض مسللمان ہند کو کہنہ پرستی، رضائیت، سہل پسندی، عزلت نشینی نے بہت پیچھے دھکیل دیا۔ البتہ جن لوگوں کو بدلتے وقت کی نزاکت سمجھ آگئی۔ وہ اپنے آپکو زمانے کے معیار کے مطابق ڈھالنے میں کامیاب ہوگئے۔ جن قوموں نے دنیوی عملی زندگی میں اور علوم جدیدہ میں اپنی حیثیت کا حساب نہیں لیتی ان کو خجالت وخواری کا سامنا کرنا پڑتا ہی ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ مسعود چودھری بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے سر سید کے بعد مسعود چوہدری اگر کسی سے مکمل اتفاق رکھتے ہیں اور متاثر بھی ہیں تو وہ ڈاکٹر ذاکر حسین سے ہی ہیں۔

شخصت اور سماج ایک دوسرے سے جدا نہیں بلکہ وہ ایک دوسرے کو متاثر کرتے ہیں۔ ہمارا سماج ابھی تک روایتی ملائیت و خانقاہیت کے چنگل میں پھنسا ہوا ہے یہ کلیسائی نظام فیوڈل ازم سے ملتا جلتا ہے جہاں صارفین اپنی زراعتی کمائی کا ایک حصہ اپنے مالک کو طوعا یا کرہا ادا کرتے ہیں اور فیوڈل لارڈ خواہ وہ پیر یا سرمایہ دار نے لوگوں کے گلے میں اپنے نام کی قلادہ بندی کر کر رکھی ہے

ان فیوڈل لارڈز یا مذہبی رہنماوں کی نام نہاد سماجی خدمات بھی شاطر دکان داروں کے سودا تولتے وقت ڈنڈی مارنے جیسا عمل ہے۔ سادہ لوح عوم بھول جاتے ہیں کہ

یہ زمانہ مسابقت و مقابلے کا ہے یہاں روزی کمانا جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔ اور وہ دن گئے جب درسی تعلیم کی کچی پکی عمارت بنا کر اس پر دینیات کی سفیدی کا ہاتھ پھیر دیا جاتا تھا اور اس قسم کے نیم خواندہ بلکہ ناخواندہ لوگ ماسٹر بن جاتے تھے۔

جدید تعلیم کا مقصد افراد کو باروزگار بنانا ہے بلکہ انہیں افراد کاسبہ اور خود کفیل بھی۔ یہ مسئلہ ریگستان میں ہل چلانے کے مترادف ہے۔ جدید علوم کے حصول کے ذریعے ہی چھپی ہوئی صلاحیتوں کو بروئے کار لایا جاسکتا ہے۔ جو قوم ایسے ہیروز کی قدر نہیں کرتی انکا عرصی حیات خود فریبی، غنیمت جوئی یاباہمی جنگ وجدل میں پھنس کر رہ جاتا ہے۔

ڈاکٹر حسین نے بنانگ دہل کہا تھا:

جو تعلیم ذہن اجتماعی کی ان زندہ تخلیقات و تجربات سے بے نیاز ہوگی فرد و جماعت کے رشتہ کو سمجھنے سے قاصر ہوگی کبھی بھی فلاح و کامیابی نہیں پاسکتی۔ یہ مسئلہ پرانے درسیٔ مولویانہ رسمیات کے مطالعے سے حل نہیں ہونے والا۔ بلکہ مردہ نظام کی طرح ریزی کی ضرورت ہے۔ اور ریکانسٹرکشن کی۔ بقول ذاکر حسین روایتی خبری علم بے جان ہوتا ہے اور بے نور اس سے نہ دماغ کو روشنی ملتی ہے نہ روح کو بالیدگی۔ بلکہ یہ نفس کی پردہ پوشی کے لئے ایک خوشنما پردہ ہوتا ہے یا ایک خالی ظرف پر چمڑا آواز بہت دیتا ہے اور اندر سے کھوکھلا۔

تجربے سے حاصل کیا گیا علم انکسار پیدا کرتا ہے اور وقار، ذہن کو تربیت دیتا ہے اور روح کی پرورش کرتا ہے ہمیشہ آگے بڑھنے کی طاقت بخشتا ہے۔ انہوں نے خود

غرضی کو ترک کر کے قومی خدمت کا جذبہ اجاگر کرنے کی اہمیت پر زور دیا۔ وہ کہتے ہیں:

" یوں تو کوئی اپنی آنکھوں پر ٹھیکریاں رکھ لے تو کوئی اسکا کیا کر سکتا ہے پر آپ کے چاروں طرف جو بیماری پھیلی ہوئی ہے افلاس اور فاقے نے عام صحت کا حال کر رکھا ہے اس کا احساس آپ کو ہو گا تو آپ چین کی نیند نہ سو سکیں گے۔

ذرا جو تیز چلے تو کوئی بھی ساتھ نہ تھا
حصار فکر ہی بس اپنا پاسبان ہوا

آپ کے سامنے ایک مہتم بالشان کام ہے۔ مضبوط دل اور بلند ہمت لوگوں کے کرنے کا کام ہے خود غرضوں کے لئے پیسے کمانے کا موقع بھی ہے۔ مگر ان کے سینے پر ہمیشہ یہ بوجھ رہے گا کہ انہوں نے اپنی بنی نوع اپنے ہم قوموں کے افلاس جہل غلامی بے بسی فائدہ اٹھا کر کچھ دھات کے سکے جمع کر لئے ہیں اور اپنی قوم کو اس نجات دلانے کے کام میں ہاتھ نہ بٹایا۔" فرقہ پسند مولویوں نے اپنے نفع کے لئے مسلکی دیواریں کھڑی کر رکھی ہیں۔ ان رسمیات کے دلدادگان، سیاسی و مذہبی نجات فروشوں کی صداوں پر کان نہ دینے میں ہی بہتری ہے کیونکہ ان بدلے ہوئے حالات میں انکی فرسودہ تعلیمات منقضی شدہ ادوائیات جیسی ہیں۔ جو کبھی شفا بخش تھیں لیکن اب زہریلی ہیں۔ لہذا ڈاکٹر ذاکر حسین کے مطابق اہل دانش نے چپ چپاتے دوسرے ترقی یافتہ اہل دنیا کے اسالیب کو اختیار کر لیا۔ عقائد پر زبانی زور دیتے رہے۔ عملاً رخصت۔ مذہبیت کے ان حصوں پر جو ورائے عقل ہیں عقلی بحثیں جاری رکھیں۔

دل کے پھپھولے جل اٹھے سینہ کے داغ سے
اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے

سیاسی اثر و رسوخ

جیسا کہ ہم جانتے ہیں سر سید کی کامیابی کا راز اس وقت کے انگریز حکام کے ساتھ تعلقات کی استواری میں پنہاں تھا۔ مسعود چودھری نے بھی یہی روش اختیار کی اور وہ اپنے مقاصد میں کامیاب ہوئے۔

اس میں کوئی کوئی شک نہیں ہر سیاسی جماعت کے رہنما نے انکی کارکردگیوں کو سراہا مثال کے طور داکٹر فاروق عبد اللہ کی سرکار کے دوران ان کے تعلقات ان سے برقرار تھے۔ ڈاکٹر فاروق عبد اللہ انکی والدہ ماجدہ مادرِ مہربان بیگم اکبر جہان بھی ٹرسٹ کے پروگراموں مین تشریف لایا کرتی تھیں۔ اسی طرح کانگرس کے رہنما بھی جن میں سونیا گاندھی شامل ہے یوم افتتاح پر حاضر ہوئیں۔ اسی طرح نیشنل کانفرنس کی حزب مخالف کے رہبر اعلی مفتی سعید جب بر سرِ اقتدار تھے تو انہوں نے مسعود چودھری کی قابلیت پر انہیں باباغلاشاہ بادشاہ یونیورسٹی کا بنیاد گزار وائس چانسلر بنایا۔ کیوں کہ انہیں بخوبی معلوم تھا کہ یونیورسٹی کا پہلا وائس چانسلر کسے بنانا ہے اور کون وہاں کامیاب رہے گا؟ میری ذات تحقیق کے مطابق مسعود چودھری سیاست سے کوئی دلچسپی نہیں وہ اپنے تعمیری کاموں میں جھٹے رہے۔ حصولِ مقاصد کے لئے سیاسی اثر و رسوخ کا بھرپور فائدہ اٹھایا۔

ریاست کے مسلسل تین گورنروں اور اتنے ہی چیف منسٹروں کے بیانات اور پیغامات جو کہ ٹرسٹ کی اخبار، یونیورسٹی کے نیوزلیٹروں، سوونیروں وغیرہ میں دستیاب ہیں سے پتہ چلتا ہے گورنروں، انکے مشیروں، چیف منسٹروں اور وزراء میں سے بہت سے حضرات نے ٹرسٹ کے کاموں میں بھرپور تعاون کیا اور مالی امداد بھی کی ۔ ریاست میں کئی تنظیموں نے انہیں انعامات بھی دئے۔

۱۹۹۹ء میں ادبی سنگت کشمیر نے مسعود چودھری کو فخر قوم اوارڈ دیا۔

اسی طرح سیٹیزن فورم جموں نے ۲۰۰۴ء انہیں فخر جموں کا اوارڈ دیا مسعود چودھری کو ریاست کی ہائیر ایجوکیشن کے ممبر بھی رہے۔ بیرون ریاست بھی انکی شہرت کم نہیں۔

۲۰۰۲ء میں چندی گڑھ میں چندی گڑھ میں راجیش پائلٹ کے مجسمے کی نقاب کشائی کی تقریب میں مسعود چوہدری مہمان خصوصی کے طور پر بلائے گئے تھے۔

اسی طرح پنچکولہ میں ۲۰۰۸ء کو گجر بھون کے یوم افتتاح پر بھی مسعود چودھری کو خصوصی مہمان تھے۔ انہوں نے بیرون ریاست گوجروں کے مسائل پر کئی لکچرز دئے ہیں اور اکثر مشاورتی و اصلاحی کاموں میں آپ سے مشورے لئے جاتے ہیں۔ علاوہ ازیں آپ کئی سوسائٹیوں سے جڑے ہیں مثلاً سیول سروس آفیسر سوسائٹی نئی دہلی اور انڈین انسٹیچیوٹ آف پبلک ایڈمنسٹریشن نئی دہلی کے بھی لائف ممبر ہیں۔

گُرجر دیش چیرٹ ایبل ٹرسٹ کے افتتاح کے روز پورے ہندوستان اور ریاست سے رہنماوں او عوامی نمائندوں کی موجودگی نے مسعود چودھری کے اثر و رسوخ کے علاوہ

انکی ہر دلعزیزی بھی ثابت کر دی۔ بیک وقت بیک اتنے عظیم سیاسی رہنماوں کا اکٹھا ہونا اچنبے کی بات ہے اور فخر کا موقع کا بھی۔

علم پروری اور کتاب دوستی

ایک دن کا ذکر ہے کہ میں نے چوہدری مسعود احمد چوہدری سے بار بار سوال کیا کہ آپ کے پسندیدہ مصنفین کون کون ہیں؟ وہ ہر بار جواب دیئے بغیر خاموش ہو جاتے تھے۔ انہوں نے مجھے کئی باتیں سنائیں۔ پنڈت نہرو کی دی گلیم پسز آف ورلڈ ہسٹری کا ذکر کرتے ہوئے وہ بار بار وہ کپکپانے لگے اور ساتھ ہی چند لمحوں کے لئے ورطہ ء حیرت میں ڈوب گئے۔ آخر انہوں نے ہمت کر کے کہا کہ وہ شخص کتنا بڑا عالم ہو گا۔ کہ جس نے جیل میں بیٹھ کر دنیا کی تاریخ لکھ دی۔ پنڈت نہرو کی شخصیت کے بارہ میں مجھے شک یا تردد نہ تھا۔ وہ خود بھی کہتے ہیں۔ حقائق تو حقائق ہوتے ہیں وہ تمہاری ذاتی پسند کی بنیاد پر چھپ نہیں سکتے۔ صداقت اپنا آپ بہر حال منوا لیتی ہے۔ صداقت تمہاری پسند و ناپسند کی وجہ سے بدل نہیں سکتی۔

اس کے بعد انہوں نے نہرو کی کچھ اور کتابوں کا ذکر کیا۔ اسی گفتگو کے دوران انہوں نے ایک کہانی شروع کر دی۔ ایک بڑے آدمی نے کہا۔" مجھے اپنی اس کتاب کو پڑھنے والوں سے یہی کہنا ہے کہ اسے ایک نناوے سال کے بوڑھے نے لکھا ہے۔ جس نے کہیں بھی یہ لکھا ہوا نہیں پڑھا اور نہ ہی کسی سے یہ سنا ہے کہ عمر کے اس آخری دور میں بھی کوئی کتاب لکھتا ہے۔ لہذا تم میری اس کتاب کو فقط میری پیرانہ بڑبڑاہٹ سمجھنا۔"

اسکے بعد انہوں نے مصنف کا نام بتایا تھری ہارس مین آف دی نیو اپیو کیلپس کی شروعات کی سطور کا متن بھی باتوں ہی باتوں میں بیان کیا۔ اسکے بعد انہوں نے میرا ہاتھ پکڑا اور مجھے اپنی لائبریری میں لے گئے۔ دنیا کے کئی بڑے ادیبوں کی معرکہ آراء کتابیں دیکھ سخت حیرت ہوئی۔ ایک الماری میں اردو کی چند کتابیں بھی دکھائی دیں۔ مثال کے طور پر چھڈ یار "دوستوں کی ساری کتابیں ان طاقچوں میں لگی ہوئی تھیں ممتاز مفتی کی درجنوں کتابیں تھی قدرت اللہ شہاب، اشفاق اللہ خاں اور ابن انشا وغیرہ کی بھی متعدد کتابیں دیکھ کر میری نظر بابار للچانے لگی۔

وہاں کچھ مشہور بائیو گرافرز، مورخوں اور بدانشورروں کی بعض کتابیں دیکھ کر مجھے رشک محسوس ہوا۔ پنڈت جواہر لعل نہرو راج موہن گاندھی نراد چوہدری، خشونت سنگھ، نپولئین وغیرہ کی کتابوں کے علاوہ ایڈوارڈ گبن کی کمیاب کتاب دی ہسٹری آف دی ڈیکلائن اینڈ فال آف دی رومن ایمپائر کی ضخیم جلدیں دیکھ کر خوشی ہوئی۔ میکس ملر وغیرہ کی کتابیں بھی دیکھنے کو ملیں۔ الوین ٹفلر اور تھامس فرائڈ مین کی کچھ کتابوں کی جھلک بھی کچھ دیکھ کر محظوظ ہوا۔ ایڈوارڈ گبن وہ برگزیدہ شخص تھے۔ جنھوں نے رومن کلچرل ڈیکے کا کیا ہی خوب تجزیہ کیا تھا۔ تادیر بات چلتی رہی۔
یہاں ایڈواڑد گبن کا قول کا ترجمہ پیش کرنا لطف سے خالی نہ ہوگا۔۔۔۔۔۔وہ لکھتے ہیں
رومن کلچر کے زوال کی پانچ بین اور واضح دلائل و اسباب یہ ہیں:

دولت پیدا کرنے اور بنانے کے بجائے (اس ریاست کے لوگوں نے دولت کی کثرت سے لذت پسندی و عیش پرستی کے راستے اپنا لئے۔

جنسی غلبہ اور جنس سے متعلق اخلاقی اصولوں کا کی تنسیخ۔
تعمیری ادب کی بجائے سنسنی خیز ادب کی تخلیق اور ہر دلعزیزی۔۔
امیر اور غریب کے درمیاں بڑھتا ہوا تفاوت۔
اور ریاست یا سرکار کے سہارے جینے کی روش عامہ۔ یعنی ملازمتوں وغیرہ کے سہارے۔
پھر وہ مجھے ایک اور کمرے کی طرف لے گئے اور دور ہی سے کتابوں کی بڑی الماری دکھائی۔ مجھے بخوبی یہ اندازہ ہوگیا کہ مسعود احمد چوہدری نے مشہور سوانح عمریوں، تاریخ سماجیات اور ادبیات اردو کا بنظر غائر مطالعہ کیا ہے۔

ہم سلامت ہیں زمانے میں تو انشاءاللہ
تجھ کو اک قوم کی جاگیر نہ ہونے دیں گے

جشن فیض اور قیامِ سیول سوسائٹی فار آرٹ اینڈ کلچر

اس میں کوئی شک نہیں کہ میر تقی میر، غالب اور اقبال کے بعد ہماری نظر کافی دیر کے لئے فیض پر رک جاتی ہے اس سلسلے میں ۲۵ فروری ۲۰۱۱ء کو وگیان بھون آفیٹوریم دہلی میں فیض صدی تقریبات کے سلسلے میں بھی ایک کافرنس منعقد کی گئی۔
جموں سیول سوسائیٹی کے بینت کے نیچے یہ کانفرنس جموں یونیورسٹی کے زورآور سنگھ آڈیٹوریم میں منعقد کی گئی۔ پاکستان سے آنے والے مہمانوں میں فیض احمد فیض کی بیٹی کے علاوہ انور مسعود، ایوب خاور کشور ناہید وغیرہ بھی تھے جن کو پہلی بار دیکھنے اور سننے کا موقعہ ملا۔ اس کانفرنس میں ندا فاضلی جیسے بزرگ شاعر بھی رونق افرز تھے انکا وہ چٹکیاں لے لے کر دوہے پڑھنا زندگی بھر یاد رہے گا۔ خونخوار درندوں کے فقط نام الگ ہیں

، شہروں میں بیابان یہاں بھی ہیں وہاں بھی ہندو بھی مزے میں ہیں مسلماں بھی مزے میں ،انسان پریشاں یہاں بھی ہے وہاں بھی ناظرین میں سیما انل سہگل، جاگیر سنگھ پنجاب کے اردو خوشبیر سنگھ شاد، استاد حامد علی خان اینڈ پارٹی کے علاوہ کتھک ڈانسر ریچا جین بھی موجود تھیں۔

غلام شاہ یونیورسٹی کا قیام

یونیورسٹی کی افتتاحی تقریب کے موقع پر مسعود چودھری نے اپنی جامع تقریر میں کہا:

"مجھے معلوم ہے کہ یونیورسٹی کے پہلے زینے پر قدم رکھتے وقت اس کی آئیندہ عظمت کے نغمے چھیڑ دینا خواب دیکھنے کے برابر ہے۔ لیکن خواب ہی تو انسانی کارناموں کا اصل سرچشمہ ہیں۔

جب اس بے مثال صاحب نظر سر سید احمد خان نے انیسویں صدی کے علی گڑھ کے لق و دق صحرا میں اینگلو اورینٹل کالج ایک جھونپڑے میں قائم کیا تو وہ ایک خواب ہی کو سنگ و خشت کے پیکر میں ڈھالنے کی پہلی کاوش تھی۔ اس وقت ان کی نظر میں ایک پاک مقصد کا اجالا اور دل میں مظلوم اور پسماندہ قوم کو علم کی روشنی سے سیراب کرنے کی تمنا تھی۔ اور بس۔

اس کے لئے انہوں نے کبھی گداگری کی تو کبھی وعظ و نصیحت کی مجلسوں کا اہتمام یہاں تک کہ ڈگڈگی بجھانے اور بندر نچانے سے بھی گریز نہ کیا تا کہ ایک بے خبر قوم اس ہنگامے سے جمع ہونے کا سلیقہ پیدا کرلے اور پھر انہوں نے اپنے محدود

وسائل و ذرائع کے قطرات سے علوم و فنون کی ایسی نہر بہا ڈالی جو آج مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی شکل میں پوری آب و تاب کے ساتھ موجود ہے۔

ایک اور شاندار مثال ہماری پیشرو جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کا قیام ہے اس درسگاہ کو مولانا محمود الحسن ،مولانا محمد علی جوہر کی پشت پناہی حاصل تھی ا۔سکی روح رواں ڈاکٹر ذاکر حسین تھے اور معاونین پروفیسر مجیب وڈاکٹر عابد حسین وغیرہ گدڑی پوش حضرات جنہوں نے اپنے آرام اور جائز تقاضوں میں کتربیونت کر کے کم سے کم مشاہرہ لیتے رہے اور بڑے علمی و فنی ادارے کو ایستادہ کر کے مہاتما گاندھی اور قائد اعظم محمد علی جناح سے تحسین و آفرین بھی حاصل کی۔

سر زمین راجوری پر ہمارے اس علمی قافلے کا رنگ و روپ بھی مختلف قوموں، نسلوں، اور مذاہب کے سرکردہ ان نوجوانوں پر مشتمل ہو گا۔ جو اس درسگاہ علمی کے فیض کو چہار دانگ عالم میں پھیلانے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کریں گے۔ ایسی میری تمنا ہے۔"

بابا غلام شاہ بادشاہ یونیورسٹی ہر طرف پھیلی ہوئی جہالت اور پسماندگی کے اندھیروں میں امید افزا روشنی کا بڑا ذریعہ ہے۔

(اقتباس از افتتاحی تقریر از مسعود احمد چودھری: خواب جو حقیقت بن گیا)

مزید اسی موقع پر مسعود چودھری نے کہا تھا:

نومبر ۲۰۰۴ء کی بات ہے جب اس یونیورسٹی کے قیام کا عمل شروع ہوا۔ تب سے اب تک کے مختصر سے عرصہ میں ہم نے جو کامیابی حاصل کی۔ وہ ہر کس و ناکس

کے سامنے ہے۔ مستقبل کی شاہراہ پر سفر کرتے ہوئے آپ کو جو نئے افق نظر آتے ہیں وہ ترقی و توسیع راہ دکھاتے ہیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ اس ادارے کی ترقی کے لئے مستقبل قریب میں ہمیں کیا کرنے کی ضرورت ہے لیکن ضروری نہیں کہ ہم جو نقشہ بنارہے ہیں وہ ناقابل تغییر نہیں۔

ہم نے ایک مرحلہ طے کرلیا ہے۔ اب یہ آنے والی نسل پر منحصر ہے کہ وہ آنے والے مراحل کو کیسے طے کرے گی۔ پچھلی دہائیوں میں ہندوپاک کے درمیان ہونے والی جنگوں کی محضر بنارہا ہے۔ مزید دہشت گردی کی وارداتوں کے دوران غریب بے گناہوں کا اسقدر خون بہایا گیا۔ کہ خون سے لتھڑی زمیں ابھی بھی مکمل سوکھی نہیں۔ اور پرانے زخم مندمل نہیں ہوئے یہی وجہہ ہے کہ یہ خطہ کم علمی و افلاس اور معاشی بحران سے پوری طرح نہیں نکل سکا ہے۔ امید کی جاتی ہے کہ یونیورسٹی اعلیٰ تعلیم کے مواقع فراہم کرے گی اور سماجی پسماندگی سے نکلنے میں نوجوانوں کی رہنمائی کرے گی۔ مزید ذہن سازی میں موثر کردار نبھائے گی۔ اور گھر گھر میں علم کی جوت جلائی جائے گی۔

بابا غلام شاہ بادشاہ یونیورسٹی کے قیام کا مقصد کا خلاصہ یہ ہے۔ بقول مسعود چوہدری مسلم تمدن و تہذیب کا احیائے نو، یونیورسٹی کے آئین کی شقِ اول ہے۔ ایسے میں، ہم نے آٹھ مہینے کے ریکاد ٹائیم میں یونیورسٹی کا تعمیراتی ڈھانچہ کھڑا کرکے اس کی چھتوں کے نیچے کلاسیں بھی بٹھادیں۔ یہ تعمیری کام چوبیس گھنٹے یعنی دن اور رات دو شفٹوں میں کرنا ہی ممکن تھا اوراس طرح ہر ہدف کو ہم نے چھولیا۔ میرے نقاد اور

متذبذب حضرات کیا کہتے ہیں؟ مجھے اس سے کوئی واسطہ نہیں۔ کسی اصول، نظریاتی نظام کی حقانیت میں شک و شبہ کا اظہار کرنے کا انہیں حق حاصل ہے لیکن میرے پاس بھی روشن دلیلیں کم نہیں۔ الفضل ماشہدت بہ الاعداء۔

آج مخالف لوگ کہتے ہیں: مسعود چوہدری کے پاس جادو کی چھڑی تھی یا پھر اللہ دین کا چراغ تو تھا نہیں پھر یہ کار دشوار کیسے اپنے انجام کو پہنچایا،، ذرا خدا کو حاضر ناظر رکھ کر سوچیں۔ یہ بلڈنگیں مشروموں کی طرح ایک ساتھ کیسے زمیں کی سطح سے اوپر اُگ ائیں تھی۔ انکے پیچھے ضرور کسی کا ہاتھ تھا جسے غیبی تائید حاصل تھی۔

۲۰۰۴ء میں بابا غلام شاہ بادشاہ یونیورسٹی کا کیمپ آفیس کے چھنی جموں میں کھولا جاچکا تھا۔ لیکن ابھی تک یونیورسٹی کس جگہ کھولی جائے گی اور کہاں؟ کسی کو کچھ پتہ نہیں تھا۔ دسمبر ۲۰۰۴ء سے لے کر جولائی ۲۰۰۵ء تک کے مختصر عرصے میں یونیورسٹی سے متعلق سینکڑوں مسائل کا معقول و مناسب حل ڈھونڈنا، ایک بڑی چنوتی کا سامنا تھا۔ بعض لوگ کہتے تھے کہ یونیورسٹی شاہدرہ میں کھولی جائے بعض لوگ کہتے تھے کہ مرادپور میں لیکن ان دونوں جگہوں پر ۱۰۰ کنال سے ذیادہ اراضی کا ملنا ناممکن تھا۔

ادھر دھنور میں پانچ ہزار کنال سٹیٹ لینڈ موجود تھا دہ شاملات قسم کی اراضی عوام کی چراگاہ تھی۔ کچھ حصہ پر مقامی لوگوں نے قبضہ کیا ہوا تھا۔ اس جگہ کے محل و موقع پر پہنچنے کے لئے ڈنی دھار دھنور جرالاں سے آگے پانچ کلومیٹر پیدل چلنا پڑتا تھا۔ ڈنی دھار تک روڈ لنک تھا لیکن آگے تو پگڈنڈی بھی نہیں تھی صورت حال یہ تھی کہ یہاں کے لوگ ایک انچ جگہ دینے کو تیار نہیں تھے۔ ان دنوں یونیورسٹی شوسٹرنج بجٹ

پر کام چلا رہی تھی۔ بنیاد گزار وی۔ سی مسعود چودھری نے لنک روڈ کا مسئلہ گورنمنٹ کے سامنے پیش کیا۔ ان کی کاوشوں سے پانچ کلو میٹر لنک روڈ منظور ہوا۔ لیکن مسئلہ اسکے نیچے آنے والی اراضی حاصل کرنے کا تھا۔ ایک حکمت عملی بنائی گئی جس کے تحت بعض مالکان اراضی کو یونیورسٹی میں کلاس فورتھ میں ملازم لیا گیا۔ اسطرح لوگوں نے سڑک کے لئے اراضی دی۔ اس دروان مسعود چودھری سمیت یونیورسٹی کے تمام اسٹاف کو پیدل ہی سفر کرنا پڑتا تھا۔

پیسے کی قلت کی وجہہ سے تعمیری کام ٹینڈر کرنے کے بجائے محکمانہ طور شروع کیا گیا۔ اور وہ بھی ڈبل شفٹ یعنی دن رات۔ جنوری فروری کے مہینے بارشیں اور ٹھنڈ میں یا جھگڑے نپٹانے میں گزر گیا۔ اپریل اور مئی کے دو مہینوں میں اوسطاً دس سے پندرہ مشینیں اور دوسو مزدور روزانہ کام کرتے تھے۔ محنت لگن جوش و جزبہ کارگر ثابت ہوا۔ فقط دو ماہ میں ۴ پریفیبریکیڈ سٹرکچر بنالئے گئے۔ متعلقہ انجینئر منظور حسین جاگل کا کہنا ہے آٹھ ماہ کے اندر ۵۰۰۰ مربع فٹ سے زائد پلنتھ ایریا پر مشتمل اکاموڈیشن کا معائینہ کرنے کے بعد آل انڈیا کونسل فار ٹیکنکل ایجوکیشن نے یونیورسٹی کھولنے کی منظوری دیدی۔ محکمانہ طور کام کرنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک تخمینے کے مطابق یونیورسٹی لاکھوں روپے کی بچت ہوئی ظاہر ہے۔ اگر وہی کام ٹینڈر پر الاٹ کیا جاتا تو رائج اور متداول ریٹوں پر زیادہ خرچہ آتا۔ اور وقت بھی بہت زیادہ لگتا۔ یونیورسٹی کا ایک سیشن ضایع ہونے کا احتمال تھا۔

یونیورسٹی کے سربراہ سے لیکر ایک چوکیدار الغرض پوری ٹیم نے ایمانداری اور ہمدردی سے کام سرانجام دیا۔ اس اکاموڈیشن میں کلاس رومز کے علاوہ پروفیسروں کے دفاتر، ٹائلٹس اور کئی بڑے لیکچرز ہال وغیرہ بھی شامل تھے۔

مسعود چوہدری نے یونیورسٹی کے یوم افتتاح پر ۱۵ دسمبر ۲۰۰۴ء کو مفتی سعید نے اپنے اپنی کیبنٹ کے بیشتر وزراء مثلاً، پنڈت منگت رام شرما، مظفر حسین بیگ، چودھری تاج محی الدین، ہرش دیو سنگھ، غلام محمود سروری، اور ایم ایل راجوری شریف طارق، ایم ایل اے گول حاجی بلند خان وغیرہ صاحبان کی موجودگی اپنی بلیغ و برجستہ تقریر میں کہا۔

تاریخ اپنی ہی قدرتی رفتار کے مطابق آگے چلتی ہیں اور مختلف کام اپنے مقررہ وقت پر پایہء تکمیل کو پہنچتے ہیں۔ ان کاموں کے کی عظیم گشت میں ہم سب کا کوئی نہ کوئی کردار نبھانا بھی پہلے ہی سے طے ہے۔ اس کردار کو ہم کس قدر سلیقے اور عمدگی سے نبھاتے ہیں اس بارہ میں ہماری اپنی رائے کوئی معنی نہیں رکھتی۔ بلکہ ہمارے کام کی شہرت ہی اسکا فیصلہ کرے گی ہم سے بے وہ وہی ہمارے کاموں کو تولے گی بھی اور پرکھے گی بھی۔

آٹھ ماہ کی مدت میں انہوں نے دعوے کا ثبوت پیش کر دیا۔

ساتھ ساتھ باصلاحیت اسٹاف کی تقرری کے ذریعہ ہر شعبے کو تقویت مل گئی۔ اور اس عمل کا بیرون ریاست ایک خوشگوار پیغام بھی گیا۔ ورنہ عموماً کمیٹیاں تو برائے نام ہوا کرتی ہیں۔ کہیں کہیں تو اپنی پسند کے امیدواروں کا انتخاب کیا جاتا ہے۔

استحقاق پر کی گئی تقرریوں کا فائدہ تو بہر حال ہوتا ہے کہ ایچنگ اسٹاف بھی دیانت داری سے کام کرتا ہے اور انہیں اپنی پراگرس دینے کا کھٹکا لگا رہتا ہے۔ جبکہ سفارشات پر بھرتی کیئے گئے ملازمین محمکہ کے لئے ایک بوجھ ہوا کرتے ہیں

بقول ڈاکٹر شمس کمال انجم۔ آپ عربی شعبہ کو مضبوط بنانا چاہتے تھے اس سلسلے میں آپ نے " الی النور" کے عنوان سے یونیورسٹی کا وژن تیار کروایا اور باہر کی یونیورسٹیوں میں بھیجا۔ جب یونیورسٹی کا ویژن عربی میں ترجمہ کیا گیا۔ تو مسعود چودھری نے مجھے اسکی اس کی اصلاح اور تصحیح کسی سینئر پروفیسر سے کروانے کو کہا۔ لہذا پروفیسر محمد سلیمان اشرف اور پروفیسر زبیر فاروقی سے وژن کے متن کی اصلاح کروائی گئی۔ الغرض شاہدرہ یوبیورسٹی کے اغراض و مقاصد کو مختلف زبانوں میں دور دور تک پھیلایا گیا اردو میں مجلا ماہنامہ عاکف کا خاص شمارہ بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔

مسعود احمد چوہدری نے ۲۰۰۵ء اور ۲۰۰۶ء کے اوائل کے دوران باہر کی یونیورسٹیوں سے کئی نامور پروفیسر بلائے اور عربی لیکچرز کا سلسلہ شروع کیا۔ ویزٹنگ پروفیسرز میں صدر شعبہ عربی دہلی یونیورسٹی پروفیسر محمد نعمان خان، سابق صدر شعبہ عربی جامعہ ملیہ دہلی پروفیسر زبیر احمد فاروقی صدر شعبہ عربی علی گڑھ، پروفیسر شفیق احمد خان ندوی، سابق صدر شعبہ عربی جواہر لعل نہرو یونیورسٹی پروفیسر فیضان اللہ اور جامعہ ملی دہلی کے پروفیسر حبیب اللہ خان شامل تھے۔

مسعود احمد چوہدری نے عربی زبان کو بابا غلام شاہ بادشاہ یونیورسٹی کے شعبہ عربی کا میڈیم آف انسٹرکشن قرار دیا۔

عربی محکمہ کی طرح دوسرے شعبوں میں بھی مسعود چودھری نے نہایت قابل ترین اساتذہ کو بلایا۔ مثال کے طور پر آپ نے منیج منٹ کے شعبہ میں پروفیسر دوست محمد جیسے سینئر پروفیسر کو لایا۔ پروفیسر دوست محمد کشمیر یونیورسٹی کے شعبہ مینیجمنٹ میں پروفیسر اور ڈین آف فیکلٹی رہ چکے تھے۔

اکیڈمیک افیئرز اور بائیو ڈائیورسٹی سٹڈیز میں پروفیسر اے کے کول جیسے مشہور پروفیسر جو بھارت میں کئی تنظیموں کے چئیرپرسن اور ممبر بھی ہیں، کی خدامات کا یونیورسٹی کو بہت فائدہ پہنچا۔ پروفیسر آر این گو ہیل جیسے باصلاحیت ڈائریکٹر بھی لائے گئے۔ اس کے علاوہ سائنسدانوں میں ڈاکٹر سوشیل ورما، ڈاکٹر اصغر علی، ڈاکٹر شری کانت بھی شامل کئے۔ بائیو ڈائورسٹی کی آنریری فیکلٹی میں مندرجہ ذیل قومی شہرت کے حامل شخصیتوں کے نام ہیں۔

سابق وائس چانسلر ایم این یو حیدر آباد پروفیسر محمد شمیم جیراجپوری، آئی سی بی جی نئی دلی کے پروفیسر سدھیر سوپوری، سابق وائس چانسلر پنجاب یونیورسٹی پروفیسر آر سی سوبٹی اور جامعہ ہمدرد کے کے سابق وی سی جناب پروفیسر ڈاکٹر جی این قاضی۔ شروع شروع میں اپیلائیڈ میتھی میٹکس میں پروفیسر ڈاکٹر عبدالخالق نے بھی اہم کردار نبھایا۔

منیج منٹ اپیلائیڈ میتھی میٹکس میں کئی طلبا و طالبات کو بڑی بڑی کمپنیوں میں نوکریاں بھی مل چکی ہیں۔

تحفظ ماحولیات بائیو ڈائیورسٹی کا قیام

مسعود چودھری نے بابا غلام شاہ بادشاہ یونیورسٹی میں بائیوڈائورسٹی پارک کے منصوبے کو عملی جامہ پہنایا۔ آجکل بابا غلام شاہ بادشاہ یونیورسٹی بھارت کا شناخت شدہ سینٹر فار بائیوڈائیورسٹی اسٹڈیز ہے۔ دنیا میں بہت سے پیڑ، پودوں وغیرہ کی قسمیں عدم آشنا ہو چکی ہیں اور گوناگوں ماحولیاتی تبدیلیوں نے کئی دوسری انواع کے نباتات کو خطرے اور جان جوکھوں میں ڈالا ہوا ہے۔ان خطرے سے دوچار پیڑ پودوں کو کسی طرح بچانے کے لئے دنیا بھر میں تحقیقی کام ہو رہا ہے۔ ہمارے خطہ جو ماحولیاتی اعتبار سے نہایت اہم ہے۔ کسی کو اس طرف دھیان ہی نہیں گیا۔ مسعود چودھری کو پہلی بار یہ خیال آیا کہ اس ریجنل یونیورسٹی میں بائیوڈائیورسٹی کے مطلق شعبہ قائم ہونا چاہئے ۔اور ایک باٹینیکل پارک بھی اس سلسلہ میں بوٹینیکل سروے آف انڈیا سے رابطہ کیا ۔اسکے ڈائیریکٹر نے ان اقدامات کو سراہا اور بھرپور تعاون دیا۔ اسی طرح نیشنل بیورو فار پلانٹ جینیٹک ریسورس سے بھی رابطہ کیا گیا۔

اس سلسلے یوبیورسٹی کی پبلیکیشنز بھی اہم ہیں ڈاکٹر اے کے کول اور آر این گوپیل اور ممتا بھٹ کی تحقیقاتی نوعیت کی اشاعتیں قابل ذکر ہیں۔ اسکے علاوہ بہت سے سکالروں نے جموں وکشمیر کے "فونا اور فلورا" پر کئی تحقیقی مضامین بھی لکھے۔ جن میں شری کارپنت اے اے شاہ، سوشیل ورما اے۔ اے زری بھی شامل ہیں۔

ڈاکٹر اے کے کول صاحب سے میں نے خود بھی طویل انٹرویو کیا۔ انہوں نے بتایا کہ مسعود چودھری نہ مجھے مدعو کرتے تو میں کبھی بھی بابا غلام شاہ یونیورسٹی میں جائین نہیں کرتا۔ انہوں نے مجھے کافی حیلوں اور جتنوں سے یہاں لایا اور پھر مجھے اخلاقی

رشتہ میں ایسا جکڑا کہ میں یہاں کا ہی ہو کر رہ گیا۔ ان کی سربراہی میں فیکلٹی کے ممبروں نے اس سلسلہ میں بہت سے سیمینار اور کانفرنسوں میں بھی حصہ لیا۔ اس طرح اس پسماندہ اور دور دراز واقع علاقے کی نباتات کے مسائل کو پہلی بار سائنٹیفیک بنیادوں اور بڑے پیمانے پر موضوع بنایا گیا۔ ابھی اس سفر کا آغاز ہی ہو سکا ہے اور بہت کچھ کرنا باقی ہے۔

اس سلسلے میں منسٹری آف انڈیا محکمہ سائنس اور ٹیکنالوجی ڈائیرکٹوریٹ آف ایریکانٹ اینڈ سپاسز، منسٹری آف انوائرنمنٹ اینڈ فارسٹ وغیرہ سے بھی بابا غلام شاہ بادشاہ یونیورسٹی کے اس بائیوڈائیورسٹی سینٹر کو مالی معاونت حاصل ہوئی ہے۔

اگر یہ راہ میں بوڑھا شجر نہ ہوتا
شدید دھوپ میں ہم سے سفر نہیں ہوتا

یونیورسٹی کے غیر آباد علاقے میں ایک وسیع عریض رقبہ پر پھیلا ہوا جنگل بھی موجود ہے ۔میں نے خود اس کے بیچ میں جاکر دیکھا ہے یہاں چیڑ، شاہ بلوط، شیشم، کیکر وغیرہ کے علاوہ خودرو جنگلی بیریوں کی قسمیں بھی موجود ہیں قدرتی کھوڑوں اور جھاڑیوں وغیرہ میں جنگی جانور بھی بکثرت ہیں۔ یہ جنگل، جنگل نہیں لگتا ہے بلکہ ہمیں ہزاروں ستونوں والے اور اتنے گنبدوں والے سبز محلوں کے کوئی وسیع و عریض سلسلہ دکھائی دیتا ہے۔

پیڑ جو کہ پنچھیوں اور پرندوں کے مسکن ہیں اور انکے بسرام کرنے کا مقام، زمین سے سطح سے اونچی محفوظ پناہ گاہیں بھی۔ لیکن افسوس ہے کہ اب اطراف کے علاقوں میں جنگلات تیزی سے کاٹے جارہے ہیں۔

باباغلام شاہ بادشاہ یونیورسٹی کا ویژن

ایک ہاتھ میں سائنس اور ٹیکنولوجی اور دوسرے ہاتھ میں متناول قومی روایتوں کو لئے ہوئے ترقی کے میدان میں آگے آگے قدم بڑھائے چلو۔

کیریکٹر آف باباغلام شاہ بادشاہ یونیورسٹی اقلیتوں کے حصول علم ماخذات کی تحقیق، تعلیم دینااور انہیں طاقت ور بناناہی باباغلام شاہ بادشاہ یونیورسٹی کا کیفر کردار ہے۔

نظریات وفرمودات :

اس یونیورسٹی کی کامیابی کاراز اور مدت قلیل میں اس کا قیام پزیر ہونا اس میں ہے کہ جب ہم عزم اور حوصلے کے ساتھ اپنا قدم آگے بڑھاتے ہیں تو کوئی ہمیں روک نہیں سکتا۔ کہنے کا مطلب یہ نہیں کہ مشکلیں نہیں تھیں اور ہمارا سفر نرم و سہل راہوں پر تھا۔ بلکہ ہم جس مقام پر اب کھڑے ہیں یہاں پہنچنے کے لئے ہمیں بہت تگ ودو کرنا پڑی۔ (مسعود)

میرا یہ خواب ہے کہ میں باباغلام شاہ بادشاہ یونیورسٹی کو علم کا ایک سر چشمہ دیکھنا چاہتا ہوں اور مہارتِ تامہ کا ایک نمونہ بھی آجکل ہمارے حکمرانوں کا یہ حال ہے کہ عوام کو عرضیاں اور درخواستیں لے کر دربدر گھومنا پڑتا ہے حالانکہ قرن اول کے

مسلمان اکابر وحکمران اپنی ذمہ داری سمجھتے تھے کہ وہ خود ضرورت مندوں کو تلاش کر کے ان تک مالی امداد پہنچائیں۔

دنیا گلوبل وارمنگ سمیت کئی موسمیاتی تبدیلیوں کی شکار ہوگئی ہے۔ پیر پنجال کوہستان کے مضافات میں پائی جانے حیاتیات، نباتات وحیونات کو خطرہ لاحق ہے ہم نے اس کے تحفظ کے لئے بائیوڈائیورسٹی سینٹر قائم کیا۔ ہم نے بائیوریسورسز میں ایم ایس سی اور پی ایچ ڈی کا پروگرام منظور کروایا۔ ہماری یونیورسٹی کو ریجنل رسورس ایجینسیز کا خصوصی وامتیازی درجہ حاصل ہے۔

بلکہ یونیورسٹیوں سے سے ایک قدم آگے بڑھاتے ہوئے ہم نے یہاں مہاتما گاندھی چئر فار ایکالوجی اینڈ اینوائرن منٹ قائم کیا۔ تاکہ ماحولیات سے متعلق گاندھی جی کے تصورات کو فروغ دے کر فطرت کو مزید تحفظ فراہم کیا جائے۔

یادرہے !بھارت میں ماحولیات میں کے حوالے سے یہ مہاتما گاندھی کے نام سے موسوم پہلی چیئر ہے۔

اس سلسلہ میں ہم نے بھارت کے ممتاز باٹینیسٹ ایچ وائی موہن رام کی خدمات حاصل کیں۔ انکے گرانقدر مشوررو ں انکی سرپرستی میں یہ سینٹر قائم ہوسکا ہے۔ کے پروجیکٹ انچارج بھی ہیں کی قیمتی آراء سے بھی ممکن ہوا۔

ہماری اس کاوش کی تعریف کرتے ہوئے۔ مرکزی وزیر برائے جنگلات و ماحولیات شری جے رام رمیش نے اس کی افتتاحی تقریب پر مالی امداد کے اعلان کے

علاوہ یہ خواہش بھی ظاہر کی کہ وہ مخصوص پالیسی کے تحت یہ اسکیم دوسری ریاستوں میں بھی اپنانے کے لئے ضروری اقدام اٹھائیں گے۔

انفس و آفاق میں پھیلی ہوئی کرشمہ سازیاں قدرت کا اظہار ہیں ہمیں چاہئے کہ ہم اس حکمت آموز اور دانش افروز کتاب کا پوری بصیرت و بصارت کے ساتھ مطالعہ کریں۔

تاریخی تقریب اور ڈی لیٹ کی ڈگری کا اوارڈ

دسمبر کے مہینے میں سورج خنک فضا میں اپنی تمازت بکھیرتا ہوا منزل کی طرف رواں دواں تھا۔ اچانک خلا میں کسی بڑے پرندے کی مانند لڑھکتا ہوا، ایک ہیلی کاپٹر نمودار ہوا دیکھتے ہی دیکھتے گرد و غبار میں سے دو قد آور شخصیتیں برآمد ہوئیں۔

ایک ریاست کے وزیر اعلی ڈاکٹر عمر عبداللہ اور دوسرے مایہ ناز شخصیت پدم شری نارائین مورتھی (این آر نارئینا مورتھی تھے۔ سابقہ صدر و مالک انفوسائس تھے ۔

دونوں مہمانان، گرامی وقار کے ساتھ کانووکیشن ہال کی طرف بڑھے اور بلا کسی تاخیر کے سٹیج پر براجمان ہوگئے۔ اساتذہ، معززین راجوری- پونچھ اور طلبا و طالبات کی موجودگی میں جھنڈا چڑھایا گیا۔ ایک تاریخی لمحہ نکھرتا، بکھرتا ہوا تاریخ کے اوقات پر ثبت ہونے جارہا تھا۔ اور ساتھ ساتھ لوگوں کو بھی عالم مستی و سرور میں انتہا کی طرف اڑائے جارہا تھا۔ سٹیج پر وہ مرکز توجہہ خاص و عام بنا تھا، ممبران گورننگ باڈی اور ٹیچنگ فیکلٹی کے نامور اساتذہ اس تاریخی لمحہ کے جلو میں رونق افروز تھے۔

شری نارائن مورتھی نے مختصر سے مگر برجستہ خطاب کے بعد یونیورسٹی کے بعد چانسلر یونیورسٹی جناب عمر عبداللہ سے درخواست کی کہ اس رونق محفل کو بے مثال خدمات کے صلہ میں ڈاکٹر آف لٹریچر کی ڈگری سے نوازا جائے۔ یہ اعلان سننا تھا کہ کھچا کھچ بھرا ہوا ہال حاضرین کی تالیوں کے ردھم کا ایک دریا بہنا شروع ہوا۔ وہ ماضی کی یادوں میں گم تھا فرط انبساط سے آنکھوں میں آنسو لئے کھڑا تھا تالیاں بند نہیں ہو رہی تھیں۔

مہمانان خصوصی محوِ حیرت تھے۔ یہ کون شخص ہے کہ جو بچوں کی رگوں میں خون بن کر دوڑ گیا ہے۔؟ وہ کس شانِ تمکنت سے، گرمیء نظارہ سے بے نیاز جاہ و جلال سے سٹیج پر آنے کے لئے تیز مگر متوازن قدم بھرتا ہوا آگے بڑھا۔ سٹیج پر پہنچنے کے بعد اس نے طلبا و طالبات پر قطار در قطار نظریں دوڑائیں اور اپنے ہاتھ ہلا ہلا کر، خسروانہ انداز سے ان کی عقیدتمندی کا جواب دیا۔ طلباء و طالبات اور معزز سامعین اسکے اشارے سے معنی پاکر خاموش ہوگئے۔ انکی تالیوں کی آواز مدھم ہوتے ہوتے آخر بند ہوگئی۔ اس نے موجودہ نسل کو تہذیبِ زندگی سے آشنا کرنا چاہا۔ ان میں تعلیم و تحقیق کی رسم کو اجاگر کرنے کی مخلصانہ کوشش کی۔ یونیورسٹی کو جس نے وقار دینا چاہا جو وقار ہماری تہذیبی اور ثقافتی اقتدار کی شناخت تھا۔

اس کے عرصہء تعیناتی کے دوران اس یونیورسٹی کی کارکردگیوں اور ہونے والی پیش رفتگیوں کا احاطہ کرکے لوگوں پر واضح کیا گیا اور اسکے ساتھ ہی وہ نہایت فروتنی سے اس عظیم اعزاز سے نوازا گیا۔ اس طرح یہ تاریخی تقریب اپنے اختتام کو

پہنچی۔اور اس کے ساتھ ہی مسعود چودھری کا نام خطہء پونچھ راجوری کی تاریخ کا اہم ترین حصہ بن گیا۔

پیغامات:

شری این این ووہرا جی

مسعود چودھری ہمارے عہد کے بڑے ادارہ ساز ہیں۔

شری غلام نبی آزاد

مسعود چودھری نے ناممکن کو ممکن بنادیا۔

بھارت کے سابقہ پردھان منتری سردار من موہن سنگھ نے کہا:

امید کی جاتی ہے کہ بابا غلام شاہ بادشاہ یونیورسٹی آف سائنس اینڈ ٹیکنولوجی ریاست جموں وکشمیر کی نوجواں نسل کی صلاحیتوں کو پروان چڑھانے،انہیں بروئے کار لانے میں قومی دھڑے کا ساتھ دے گی اور ریاستی وملکی ترقی میں منصافانہ کردار بھی نبھائے گی۔

سرراس مسعود ور چودھری مسعود: تقابلی مطالعہ

شوق زلف تونہ تنہادل ماشیدا کرد
ہر کہ این سلسلہ رادید جنون پیدا کرد

علی گڑھ ایل ایل بی کے دوران چودھری مسعود نے سرسید ،ڈاکٹر ذاکر حسین اور سرراس مسعود وغیرہ کے حالات پڑھ کر ان سے تحریک لی تھی۔زندگی کے کسی بھی لمحے میں رونما ہونے والا کوئی ایک واقعہ سانحہ ،تجربہ یا مشاہدہ ضروت یا شدید جزبہ یا احساس سارے وجود پر ایک حاوی محرک بن کر چھاجاتا ہے اور یہ جنوں ودیعت میں چھپی ہوئی صلاحیتوں کو منکشف کر دیتاہے اور بروئے کار لانے میں مدد کرتا ہے۔جن کا شعور انسان کو پہلے نہیں ہوتا انسانی تاریخ ایس مثالوں سے بھری پڑی ہے۔ جنھوں نے اچانک کسی جزبہ یا احساس کے غلبہ کے سبب اپنی مروجہ زندگی کارخ بدل لیا۔اور ایک مقصد ایک نصب العین کے حصول اور تکمیل کے لئے میدانوں میں اتر کر مثالی کارنامے سرانجام دیے۔ جن سے ان کے فرض منصبی سے بظاہر کوئی تعلق نہیں تھا ۔مسعود چودھری کا شمار بھی ایسی شخصیتوں میں ہوتا ہے۔

سرسید نے سرراس مسعود کو اسکول لانے اور لیجانے کے لئے بگھی بنوائی تھی۔نوابوں کی طرح نوکر چاکر انکے آگے پیچھے ہوتے تھے ۔جبکہ مسعود چودھری پرایمری لیول پر کالابن سے روزانہ آٹھ دس کلومیٹر سفر طے کرکے چھترال اور مینڈھر آیا کرتے تھے۔

سر راس مسعود نے تعلیم انگلینڈ میں کی مشہور زمانہ انگریز اساتذہ انکے ٹیوٹر تھے ۔ جبکہ مسعود چودھری کالج میں مقامی اساتذہ سے پڑھے اور علی گڑھ سے درجہ امتیازی میں ایل ایل بی کی ڈگری حاصل کی۔

سر راس مسعود نے آئنسٹائین اور دیگر مشاہیر کو چٹھیاں لکھ کر علی گڑھ یونیورسٹی کے گرے ہوئے معیار کو بلند کر کے علی گڑھ یونیورسٹی کو برے دنوں میں عظمت و وقار بخشا۔ جبکہ مسعود چودھری نے بغیر کسی عملی نمونے کے ایک سنگلاخ دھرتی کو کاٹ کر شہر سے جوڑ دیا بلکہ ایک بیابان کو شہر بنا دیا۔ اسکے آٹھ ماہ کے اندر مثالی یونیورسٹی کا قیام عمل میں لایا۔ دور افتادہ اور ساتھ ہی اس کٹ آف علاقے کی اس یونیورسٹی کو اچھے اساتذہ کی ٹیم بھی مہیا کی۔

مسعود چودھری مسلسل کئی سال یونیورسٹی کے وائس چانسلر رہے۔
اور پھر مسعود چودھری کو ڈی لٹ کی ڈگری دے کر یونیورسٹی سے الوداع کیا۔ شاید یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ سر راس مسعود کو ڈاکٹر ضیاء الدین نے کورٹ کیس کے ذریعے استعفاء دینے پر مجبور کر دیا۔ کہنے کا مقصد صرف اتنا ہے زمانے الگ تھے پس منظروں میں بھی زمین و آسمان کا فرق تھا لیکن مسائل اور مشکلات کی نوعیتیں ملتی جلتی تھیں۔ مسعود چودھری کی کوئی سیاسی یا خاندانی بیک گراونڈ نہیں تھی ۔لہذا انکے یہ کارنامے کرشمے ہیں۔ سر راس مسعود پہلے سے بنائے گئے پلیٹ فارم پر سین پیش کر رہے تھے۔ جبکہ مسعود چودھری نے اپنے لئے تمام پلیٹ فارم بھی خود بنائے۔ اور کردار نگاری خود کر کے انہین پیش بھی خود ہی کیا۔

گرجر شناخت و تشخص کے مسائل اور گورجر دیش چیرٹ ایبل ٹرسٹ چھنی جموں کا قیام یومِ افتتاح کے موقع پر مسعود چودھری نے گرجر دیش چیرٹ ایبل ٹرسٹ کی غرض وغایت کا یوں اظہار کیا۔

گرجر دیش چیرٹ ایبل ٹرسٹ دیگر تنظیموں کی طرح کسی سیاسی یا سرکاری تنظیم کا نام نہیں بلکہ یہ ایک تحریک ہے۔ ایسی تحریک جس نے راتوں رات جنم نہیں لیا۔ بلکہ جو سوچے سمجھے، منصوبے اور جہد مسلسل کے نتیجے میں معرضِ وجود میں آئی۔ اس تحریک کا مقصد گوجر قبائل کو انکی داخلی طاقت، انکے شاندار ماضی، عظیم تاریخ اور مہتم بالشان ثقافتی ورثے کا احساس دلایا جائے اور ساتھ ہی باور کرایا جائے کہ مسلسل استحصال اور ظلم وزیادتی کے نتیجے میں انہوں نے بہت کچھ گنوا دیا ہے اور جس گہری نیند میں سو چکے ہیں انہیں اس سے جنجھوڑ کر جگانے کی ضرورت ہے۔

جن لوگوں نے اس ٹرسٹ کو بہ تدریج آگے بڑھتے ہوئے اور ترقی کے منازل طے کرتے ہوئے دیکھا ہے انہیں اس بات کا بخوبی اندازہ ہے کہ ہم اس دادرے کو ادارے کی بجائے تحریک کیوں سمجھتے ہیں۔ اس ٹرسٹ کی ترقیاتی پیش رفت اور کامیابی کا ہر شخص بچشم خویش مشاہدہ کر سکتا ہے ۔ تعلیم کے میدان میں ہماری پیش رفت کو سراہا جارہا ہے اور ہماری کوششوں کی ستائش کی جاری ہے۔ جموں اور اسکے مضافات میں سکولوں کا ایک سلسلہ قائم کر کے ہم نے نہ صرف لوگوں میں بیداری پیدا کی ہے بلکہ ناخواندگی کے خلاف ایک تحریک اور مہم کا آغاز بھی کیا۔ آگے ہماری کوشش ہوگی کہ یہاں ایک ٹرائبل یونیورسٹی کا قیام عمل میں لایا جائے تاکہ اسکے ذریعہ

ہم سماج کے پسماندہ، ناخواندہ اور پچھڑے ہوئے طبقات کو نئے نئے شعبوں میں اعلی تعلیم دے کر کامیاب زندگی گزارنے کے قابل بنا سکیں اور ناخواندگی اور بے روزگاری سے نجات دلا سکیں۔ تقریباً بیس سال جن باحوصلہ اور باشعور افراد کی۔

اجتماعی کوشش کے نتیجے میں گرجر دیش چیرٹ ایبل نے وجود کا جامہ زیب کیا آج بھی ان کے حوصلوں میں وہی تازگی اور انکی آنکھوں میں وہی چمک نظر ااتی ہے۔ جو اس تحریک کے آغاز میں انکے حوصلے اور اور انکی نگاہوں میں دکھائی دیتی تھی۔

قدیم سرمائے اور قبائلی میراث کا تحفظ کوئی معمولی کام نہیں۔ اس کے لئے دوربینی، عزم و ہمت کی ضرورت ہے۔ چنانچہ جموں شہر کے چھنی ہمت بائی پاس روڈ پر ہم نے گنبدوں سے آراستہ و پیراستہ سینٹر فار کلچپت اینڈ ہیر ٹیج کی جو پرشکوہ عمارت کھڑی کی ہے۔ اسکے حسن و جمال کو دیکھ کر وہاں سے گزرتے ہوئے دیکھنے والا ہر شخص مسحور و مبہوت رہ جاتا ہے۔ اس پرشکوہ عمارت کی تعمیر میں ہم نے جو سرمایہ لگایا ہے۔ وہ اہم نہیں ہے بلکہ ہم وہ دوربینی، دوراندیشی اور وہ جدت فکر ہے جس کے نتیجے میں اس نے سنگ و خشت کا پروقار لباس زیب تن کیا۔ وہ یقیناً دیدہ زیب ہے اور لائق تحسین متعدد مقاصد کے لئے استعمال میں لائے جانے والے اس سینٹر کو ہم گرجر طبقے کے نام منسوب و معنون کرتے ہیں۔ یہ سینٹر بلاشبہ تاریخی و تہذیبی اہمیت کا حامل ہے۔ اگرچہ گرجر قبائل کی تاریخ عظیم الشان کارناموں سے معمور ہے اور ان کے پاس صدیوں پر محیط قابل صد افتخار تہذیبی و ثقافتی سرمایہ ہے۔ لیکن ہم جس مہتم بالشان کلچرل سینٹر کا ذکر کرتے ہیں۔ اسکی نظیر صدیوں میں مشکل سے ملے گی۔ یہ سینٹر پورے برصغیر میں

بالعموم اور ہمارے ملک میں بالخصوص ایک اہم کارنامے کی حیثیت رکھتا ہے اور پوری دنیا کو حیات آفرین تصور پیش کرتا ہے۔

آواز گُرجر (ماہنامہ اخبار) کا اجراء

عزمِ محکم ہو تو ہوتی ہیں بلائیں پسپا
کتنے طوفان پلٹ دیتا ہے ساحل تنہا

گوجر سماج قومی و ملکی سطح پر صدیوں تک عدم توجہی کا شکار ہو جانے کے بعد طاق نسیاں کی زینت بن کر رہ گئی ہے۔ اسی وجہ سے گوجری زبان کے ادب کے ارتقاء می تاریخ چند ایک سال سے ہی شروع ہوئی ہے۔ وہ شدید تاریخی نامساعد حالات و واقعات جن سے یہ طبقہ اس کی زبان و ادب ماضی میں دوچار رہے ہیں کے پیش نظر اس طبقہ کو معہ اپنی زبان و ادب بہت پہلے مٹ جانا چاہئے تھا۔ محنت و مشقت، کاوش پیہم، قوت ارادی، ہمت و استقلال اور امیدِ فردا کے سہارے اپنے آپ اور اپنے ادب کو کسی نہ کسی رنگ میں زندہ رکھا۔ اسکے اجرا کے موقع پر محمد یوسف ٹینگ صاحب نے ۱۶ فروری ۱۹۹۵ء کو کہا تھا۔

گرجر چیرٹ ایبل کچھ عرصہ سے میدان میں ہے لیکن سچ پوچھئے تو یہ ابھی خواب ہے اک خواب جسے تعبیر کی پوشاک چاہئے۔ میں آواز گرجر کے اجرا کو اس صورت میں زندگی کے پہلے نشان یعنی تنفس کے اجرا کے برابر سمجھتا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ سانس لینے کی چھوٹی سی دھونکنی اس بہت قومیت کے کئے صور اسرافیل ثابت ہوگی اور اسکے مومیائے جسم میں حرکت ولولے اور امنگ کے وہ آثار نمودار ہوں

گے۔ جنہوں نے کبھی اسے نوع انسان کے ابتدائی زاویوں میں عظمت کا شرف عطا کیا تھا۔ تنفس جوش و حرارت کی علامت ہے اور یہی زندگی کا خاصہ بھی ہے۔ آواز گرجر جس صدائے حق کو بلند کر رہا ہے اس کے لئے جوش ضروری ہے مگر کوئی ہنگامہ ضروری نہیں شاعر کے بقول یہ ایسی آواز ہے کہ گھن گھرج کے بغیر بھی اپنی صداقت منوا کے رہے گی یہ ایک روایت کو بھی تازہ کرتی ہے جموں و کشمیر میں گوجری اور گوجروں کے لئے سب سے پہلی آواز ایک اخبار کے صفحات پر ہیٔ بلند ہوئی تھی اور وہ بھی جموں ہی سرزمین پر میں اس ننھے پودھے کو ایک بڑے دیودار کی طرح لہراتا دیکھنا چاہتا ہو بے شک شروع شروع میں اس ماہنامے کہیے یا جریدے میں گوجروں کی تعلیم سے متعلق اہم مضامین چھاپے گئے ۔جو گوجروں کی تاریخ کے حوالے سے بہت اہم ہیں۔

ان میں جے سی شرما صاحب کا مضمون اے پسٹورل نو میڈک ٹرائب، آواز گرجر کی جلد اشمارہ امیں شامل ہے ۔اس میں قبائلی اور خانہ بدوش گوجروں کی تعلیمی مشکلات پر ایک بحث کی ہے۔ اور انکے مسائل کو منظر عام پر لا کر انکے حل کی جانب توجہہ مبذول کروانے کی کامیاب کوشش کی گئی ہے۔

اسی طرح جیا لعل مام صاحب کا "گوجرز اے پرامیننٹ اتھنک ٹرائب" جیسے معنی خیز تاریخی اہمیت کے حامل مضامین پڑھنے کو ملے۔

اسی طرح آواز گرجر کی جلد دوم شمارہ ۲ کے ذریعے ممتاز عالم و فاضل شخصیت ڈاکٹر صابر آفاقی کا خوبصورت اور معلوماتی مضمون "سنگرٖ۔ گوجر قبائل کا موسمی سفر" اسی طرح چودھری قیصر الدین قیصر کا ایک مضمون بھی نہایت معیاری و مقصدی

دستیاب ہو سکا وہ ہے "گوجری لوک ادب ایک جائزہ" اب مضامین کی شگفتگی اور تازگی کے کیا کہنے۔

اسی شمارے میں بیگم شیخ محمد عبداللہ مرحومہ "پٹرون آف ڈون ٹراڈن" جوہر لال مام صاحب کا نادر مضمون بھی شامل ہے اس کے ساتھ ہی ہری اوم صاحب "گوجرز لارڈز آف فارسٹز" وغیرہ آج بھی محفوظ ہیں گورجر سنٹر فار کلچر ایڈ ہیرٹیج کا خصوصی شمارہ کے علاوہ اگر آپ ان جرائد کو رینڈم طور پر اٹھا کر دیکھیں گے تو پتہ یہ چلتا ہے کہ محنت کی گئی ہے۔اگست ۱۹۹۸ء کا شمارے میں مسعود چودھری کا ایک انٹرویو بھی شایع ہو چکا ہے۔ لیکن کئی سالوں سے یہ اخبار بند کیا جکا ہے۔

گورجر دیش چیرٹ ایبل ٹرسٹ نے کئی ایتھنو کلچرل ہیرٹ اتج پر کئی ورکشاپوں اور سیمناروں کے علاوہ آواز گرجر ماہنامہ جریدہ کی اشاعت کا سلسلہ بھی کچھ عرصہ تک جاری رکھا۔ ٹرسٹ نے ایک لائبریری اور میوزیم بھی قائم کیا ہے۔ علاوہ ازین ٹرسٹ نے اپنے خرچے پر کئی کتابیں بھی شائع کی ہیں ۔ان میں اے شارٹ ہسٹری آف گجرز۔ مصنف رانا علی حسن چوہان اور کچھ اور تین کتابیں ڈاکٹر جاوید راہی کی بھی شامل ہیں جن کے نام یہ ہیں گوجر شناخت کا سفر، لوک ورثو اور گوجری لوک گیت۔ جنکی ادبی و سماجی قدر و قیمت کا تعین کرنا ابھی باقی ہے۔ اس کتاب میں طوالت کا خوف تھا لہذا بحث سے احتراز کیا ہے۔

۲۹ مئی ۲۰۱۰ء کو اس تقریب کے موقع پر ڈاکٹر عبداللہ نے مزید فرمایا:

میں اس قوم سے کہتا ہوں کہ جب تک خود نہیں جاگو گے اللہ بھی تمہاری مدد کے لئے نہیں ائے گا۔ اس لئے بیدار ہو جاو۔ یاد رکھو۔ سیدھی انگلی سے گھی نہیں نکلتا۔ اپنے حق کے لئے آواز بلند کرو۔ لوگ نہیں چاہتے تھے کہ مسز سونیا گاندھی یہاں آئیں۔لوگوں نے رخنے ڈالے مگر مسز گاندھی یہاں آئیں۔ میں انکو مبارک باد دیتا ہوں کہ آپ یہاں تشریف لائیں۔ مسز گاندھی نے آج ان لوگوں کو بہت حوصلہ دیا ہے۔ جموں وکشمیر اور پورے ملک کے گجر اور جہاں جہاں یہ لوگ رہتے ہیں آج انکا دل دیکھ رہا ہے کہ ان کے لئے سچ مچ کس کا دل دھڑکتا ہے۔

ڈاکٹر فاروق عبداللہ کے بعد محترم جناب غلام نبی آزاد نے اس موقع کی مناسبت سے فرمایا۔ آج جہاں اقتصادی حالات بہتر ہو رہے ہیں۔ سائنس و ٹکنالوجی کا دور دورہ ہے بہت بڑی تعداد میں گریجیوٹس پیدا ہو رہے ہیں ۔ وہیں ہماری تہذیب و ثقافت ختم ہو رہی ہے۔ کیونکہ جو لوگ آگے بڑھتے ہیں وہ ایسے ماحول میں جاتے ہیں جہاں ایک ہی قسم کے کپڑے پہننے کی رٹ لگی ہوتی ہے۔ بہت سارے ممالک کے لوگ آج بھی اپنی بھاشا کو نہیں جانتے۔ لیکن یہاں لوگ انگریزی میں بولتے ہیں ۔ اپنی مادری بھاشا میں نہیں بات کرتے۔ اپنی ریاست وعلاقے میں بھی اس کے فروغ کے لئے کچھ نہیں کرنا چاہتے۔ میں مبارک باد دیتا ہوں کہ اس طرح کا کلچر جو ہزاروں سال سے چلا آرہا ہے۔ اور پہاڑوں اور غاروں میں آج بھی پنپ رہا ہے۔ اس کو باقی رکھنے کے لئے قدم اٹھایا جارہا ہے۔ اس کو باقی رکھنا بھی ہمارے لئے بہت ضروری ہیں کیونکہ ہمارے

ملک کی سب سے بڑا خزانہ ہماری دولت نہیں مختلف مذاہب کے لوگ لباس بولیاں ہیں۔ اس کے تحفظ کے لئے کام کرنا ضروری ہے۔

اس کے بعد کانگریس کے ریاستی صدر اور سابقہ مرکزی وزیر پروفیسر سیف الدین سوز نے اس تاریخی موقع پر فرمایا:

گوجری تاریخ میں آج کا یہ دن ایک یادگار دن ہے۔ گجر بکروال طبقے کے ذمہ دار لوگ یہاں موجود ہیں مجھے خوشی ہے کہ آپ لوگ اس دن کو عید کی طرح منائیں گے۔ میں اس خوشی میں آپ کے ساتھ شامل ہوں۔

ٹرست کی تاسیس کے حوالے سے بات کرتے ہوئے آپ نے کہا:

مجھے یاد ہے ۔ البتہ تاریخ یاد نہیں ۔ فاروق صاحب کی والدہ بیگم شیر کشمیر نے مجھے فون کیا۔ جب میں بیگم شیر کشمیر کے ساتھ یہاں آیا ۔ یہ عمارت نہیں تھی بیگم صاحبہ نے کہا: مسعود کچھ کام کرنا چاہتا ہے اسکول اور کالج بنانا چاہتا ہے۔ معلوم نہیں یہ کر سکے گا کہ نہیں بیگم شیر کشمیر کی خواب کو عملی جامہ پہنے ہوئے دیکھ کر مجھے خوشی ہوئی ہے۔ مسعود صاحب نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ مل کر بہت ہی قابل قدر کارنامہ کیا ہے انہوں نے ایک طرح سے ریگستان میں ہل چلایا ہے۔ مزید فرمایا جموں وکشمیر میں گجر بہت بڑی تعداد میں موجود ہیں ۔ اس کے علاوہ پنجاب اور گجرات کے علاقے میں بھی۔

مسعود صاحب نے گجر بکروال طبقے کے لئے جو کارنامہ انجام دیا ہے وہ سنہرے حرفوں میں لکھا جائے گا۔

بی شک مسعود صاحب نے پہلے ٹرسٹ بنایا اور اب کلچرل سینٹر بنایا گجر بکروال کی جو ثقافت ہے تہذیب ہے میراث ہے اس کو بچانے کی طرف اہم قدم ہے۔ اس نوعیت کا ملک بھر میں یہ سب سے بڑا اسنٹر ہے۔ آنے والی نسلیں اس مبارک کارنامے کو یاد کریں گی۔

جناب عمر عبداللہ نے کہا۔ آج گجر سینٹر کی عمارت کا افتتاح عمل میں آیا یہ بہت شاندار عمارت ہے۔ جموں میں اس عمارت کا کوئی مقابلہ نہیں۔ حقیقت یہ ہے لال قلعہ اور تاج محل بھی عمارتیں ہیں لیکن اس عمارت سے اس قوم کو کیا فائدہ ہوگا۔ اس عمارت میں جان ہونی چاہئے ایک دھڑکتا دل ہونا چاہئے۔ اس میں اکیڈمک اور سائیٹیفیک ریسرچ ہونا چاہئے۔ اس قوم کے لوگ ذہنی اور دماغی اعتبار سے کسی سے کم نہیں۔

محترمہ سونیا گاندھی نے گجر دیس ٹرست کے افتتاح کے موقع اپنے بھاشن میں کہا۔ کانگرس اور گجر سماج کا رشتہ آج کا نہیں، جواہر لعل نہرو جی اور راجیو جی نے ہمیشہ اس سماج کی چنتا کی ہے۔ میں سمجھتی ہوں کہ اس کی مشکلات کو دور کرنا ہمارا پہلا کاریہ ہونا چاہئے۔ میں جانتی ہوں اس سماج میں ابھی ابھی بہت غریبی ہے۔ پچھڑا اپن ہے۔ لیکن میں یہ بھی جانتی ہوں کہ اپنے سوا ابھیمان کی رکھشا کے لئے آپ ہر قیمت چکانے کے لئے تیار رہتے ہیں۔ اور کسی بھی سنگھرش میں کسی سے بھی پیچھے نہیں رہتے رہتے ہیں۔ ہمیشہ سفر میں رہنے کی وجہہ سے آپ کا سماج تعلیم کے معاملے مین وہ ترقی نہیں کر پایا جیسا کہ کرنا چاہئے تھا۔ مجھے خوشی ہوئی ہے کہ گجر سماج ہر شرط پر اچھی تعلیم

دینے کی کوشش کر رہا ہے۔ راجوری میں بابا غلام شاہ بادشاہ یونیورسٹی قائم کر کے بہت اچھا کام کیا ہے۔ کم مدت مین یہ یونیورسٹی آگے بڑھ گئی ہے میں چودھری مسعود اور انکے ساتھیوں کو مبارک باد دیتی ہوں کہ انہوں آپ سب کے کاموں کی ذمہ داری لی ہے۔

جس طرح ہماری یو پی اے سرکار نے پورے جموں وکشمیر کے وکاس اور ترقی کے لئے ہر طرح کی یوجنائیں اور کاری کرم لاگو کیا ہے۔ اسی طرح گجر بکروال سماج کو اچھی تعلیم لاگو کرنے کے لئے جو بھی کرنا چاہیں۔ کیندر سرکار سے پوری مدد دلوائی جائے گی۔ اچھی تعلیم کے بغیر کوئی سماج اور دیس ترقی نہیں کر سکتا۔ جس رفتار سے دنیا آگے بڑھ رہی ہے اسی رفتار سے بھارت بھی آگے بڑھ رہا ہے۔ ضروری ہے کہ آپ بھی اس کے مطابق آگے بڑھیں۔

دنیا کی ساری تہذیبیں مٹ رہی ہیں لیکن اطمنان کی بات یہ ہے کہ گجر سماج نے اپنی پہچان برقرار رکھی ہے۔ یہ کلچرل کمپلکس سماج کی کلا کاریہ سنسکرتی ساہتیہ کو محفوظ کرنے کا کام کرے گا۔ اس سماج کو تیزی سے آگے برھانے کا موقع پیدا کرے گا۔ ایسے تمام کاموں کے لئے آپ کی پوری مدد کی جائے گی۔

آج میں دعا کرتی ہوں کہ گجر بکروال سماج پھولے پھلے۔ اور جموں وکشمیر کی ترقی میں، دیس کے وکاس میں اپنا یوگدان کرتا رہے۔ کلچرل کمپلکس کا اُدگھاٹن کرتے ہوئے میں ٹرسٹ کے سبھی ساتھیوں کو بدھائی دیتی ہوں۔

پیغامات:

لیفٹینٹ جنرل (ریٹائرڈ) ایس کے سنہانے کہا:

شاندار کلچرل کمپلکس جو کہ گرجر دیش چیرٹ ایبل ٹرسٹ نے تعمیر کیا ہے۔ اس باوقار قوم کی ترقی کی راہ کا اہم سنگ میل ہے۔ میں پر امید ہوں اور میری دعا ہے کہ یہ ادارہ اس قبیلہ کے افراد میں تبدیلی لائے۔ اور انکی خوشحالی اور اقبال مندی کا نقیب و دربان ثابت ہو۔

ریاست کے گورنر شری این این ووہرا نے کہا:

میں گوجر دیش چیرٹ ایبل ٹرسٹ کو اس خوبصورت کمپلکس کی تعمیر پر مبارکباد دیتا ہوں۔ یہ اس بات کی ضمانت دیتا ہے کہ یہاں سے ثقافتی کثرتیت کا ظہور ہو گا۔ اس طرح ملک بھر میں ہر جگہ پرانی ثقافت کو محفوظ اور نقل کرنے کی صحت مند روایت قائم ہو سکی گی۔

میں مسعود احمد چودھری کو خراج تحسین پیش کرتا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ وہ یہ فلاح و بہبود کا یہ سلسلہ جاری رکھیں گے۔ بالخصوص بچوں اور عورتوں کے لئے۔

بیگم شیخ محمد عبداللہ اکبر جہاں کا پیغام

بیگم صاحبہ مرحومہ نے گوجر سین ٹر فار وکیشنل ٹریننگ کا سنگ بنیاد رکھتے ہوئے کہا۔

"زندگی میں میری یہ کوشش رہی ہے کہ میں پسماندہ طبقہ جات کی فلاح کا کوئی کام کر سکوں۔ یہ خواب گرجر دیس چیرٹ ایبل کے سلسلہء تعمیر کے روپ میں

شرمندہ تعبیر ہو سکتی ہے۔ مزید نیک خواہشات کے ساتھ ہی گزارش کرتی ہوں کہ جو کوئی بھی کچھ کر سکتا ہو اسے چاہئے کہ وہ اس ادارے کی مالی امداد کرے"۔

چیف منسٹر مفتی محمد سعید

مسعود احمد چودھری کی سرپرستی میں گرجر دیس چیرٹ ایبل ٹرسٹ نے قابلِ ستائش اور معنی خیز کارکردگی سرانجام دی ہے۔ مسعود چودھری نے اپنی قوم کو عصری اور مستقبل کی ضروریات سے باخبر کیا ہے۔ مزید بڑی جانفشانی سے کئی مفید پروگراموں اور اہم پالیسیوں پر عمل درآمد کروایا ہے۔ گرجر دیس چیرٹ ایبل ٹرسٹ کی ہر کامیابی اور افادیت کے پیچھے وہ علامتی وتصوارتی ستون کی طرح کھڑا دکھائی دیتا ہے۔

ریاست کے سابقہ وزیر اعلیٰ ڈاکٹر فاروق عبداللہ نے کہا:

میں مسعود چودھری کو کئی سالوں سے جانتا ہوں۔ اس کے فعال کردار نے ہی ٹرسٹ کو موجودہ درجہ تک لایا ہے۔ شاید ہی کوئی سوچتا ہو کہ معجزے ہوتے ہیں۔ ناساز گار حالات میں نہ جھکنے اور عزمِ محکم کے باعث ہی مسعود چودھری ناممکن کو ممکن بنا سکا ہے۔ اس نے رکاوٹیں ہٹا کر ترقی کی سڑک کو صاف کر دیا ہے۔

سچن پائلٹ نے کہا:

گرجر دیش چیریٹ ایبل ٹرسٹ نہ صرف گوجروں کے مسائل کا حل ڈھونڈنے میں کوشاں ہے بلکہ یہ دیگر پسماندہ گروپوں کو پسماندگی اور فراموشی سے باہر نکال کر انکی حالت فعال بنانے کی ترغیب دیتا ہے۔ انکی نئی معاشی وسماجی مرتبہ بندی بھی

کرتا ہے۔ اس کثیر المقاصد تہذیبی سینٹر کا افتتاح گوجروں کی راہ میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اور یہ ادارہ ہر طرح کی ذاتی و عوامی امداد کا مستحق ہے۔

مسعود احمد چوہدری معاصرین حضرات کی نظر میں

بابا غلام شاہ بادشاہ یونیورسٹی ایک معجزہ

پروفیسر قدوس جاوید معجزے ہوتے ہی نہیں کئے بھی جاتے ہیں۔ لیکن معجزہ وہی سرانجام دے سکتا ہے۔ جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی توفیق بھی شامل حال ہو اور جو قوم کے حوالے سے تعمیری ذہن، وژن اور جرات رندانہ بھی رکھتا ہو۔

جیسا کہ میں نے کہا بابا غلام شاہ بادشاہ یونیورسٹی ایک معجزہ ہے۔ جسے مرد آہن ڈاکٹر مسعود چودھری نے کر دکھایا ہے۔ بقول مسعود چودھری، وہ ۱۵ دسمبر ۲۰۰۴ کا دن تھا جب اس یونیورسٹی کے قیام نے جنم لیا۔ اور آٹھ ماہ کی مدت قلیل کے بعد خواب نے حقیقت کا جامہ پہنا۔ جو کچھ متذبذب لوگوں کی نظر میں ناقابل یقین تھا۔ مگر مثبت سوچ کے حامل لوگوں کے لئے یہ ایک ایسا کارنامہ ہے جو کسی معجزے سے کم نہیں۔

لیکن بابا غلام شاہ بادشاہ یونیورسٹی کے قیام کو معجزہ کیوں کر تسلیم کیا جائے۔ اس کے نیچے دئے گئے چند ٹھوس حقائق پر غور کرنا ہوگا۔

اول یہ کہ باباغ غلام شاہ بادشاہ یونیورسٹی کے قیام کے لئے جس علاقے کا انتخاب کیا گیا۔ وہ علاقہ شہری حدود سے بارہ کلومیٹر دور تھا۔ صدیوں سے یہ علاقہ شاملاتی علاقے کے طور پر رجسٹرڈ تھا۔ اس علاقے کا بڑا حصہ یا تو بلند و بالا پہاڑوں اور جنگلات پر مشتمل تھا۔ ایک بے آب و گیاہ چٹیل میدان تھا۔ اس خطہ ارض کو دیکھ کر

عام لوگوں کی رائے یہی بنتی تھی کہ اس علاقے میں عملی طور پر مجنوں کی طرح صحرا نوردی یا فرہاد کی طرح کوہ کنی تو ممکن ہے۔ لیکن یونیورسٹی قائم کرنا مشکل نہیں بلکہ ناممکن ہے۔

دوئم یہ علاقہ جری، جفاکش گوجر قبیلے کے اختیار میں تھا۔ گوجر قوم کے لوگ فطرتاً جتنے سادہ ہوتے ہیں اتنے ہی ضدی اور اکھڑ بھی ہوتے ہیں۔ بابا غلام شاہ بادشاہ یونیورسٹی کی مجوزہ زمین بھی ناخواندہ لوگ آباد تھے جو علم اور تعلیم کی افادیت سے نابلد تھے۔ ان کے اندر شعور کی وہ شمع روشن نہ تھی۔ جس کی روشنی میں یہ دیکھ پاتے کہ یونیورسٹی سے تعلیم حاصل کر کے ان کی نئی پود کس طرح قوم کا حال سنوارنے اور مستقبل کو نکھارنے کی اہل ہو سکتی ہے۔ لہٰذا تعلیم کے نام پر اب سے مطلوبہ زمین حاصل کرنا ہتھیلی پر سرسوں جمانے سے کم دشوار نہ تھا۔ مسعود چودھری نے ایک طرف تو ان معصوم لیکن اڑیل اور ناخواندہ لوگوں کو قائل کیا۔ دوسری جانب حکومت سے سات سو ایکڑ اراضی حاصل کر کے اپنی تحویل میں لے لی۔ یہ مسعود چودھری کے معجزے کی پہلی زمینی سطح ہے، کہ جس علاقے میں یونیورسٹی قائم کرنی تھی وہ علاقہ دشوار گزار پہاڑوں اور جنگلوں کی وجہ سے میلی ٹینٹوں کے لئے محفوظ جگہ تھی۔

مسعود چودھری کے معجزے کی دوسری سطح یہ ہے وہ لوگ کسی بھی قیمت پر یہ علاقہ چھوڑنے کے لئے تیار نہ تھے۔ عام لوگوں کا خیال تھا کہ اگر یونیورسٹی کسی طرح بن بھی گئی تو طلباء اور اساتذہ گولی کے خوف سے نہیں آئیں گے۔ لیکن مسعود چودھری

نے غیر معمولی، قوت ارادی اور حکمت عملی کو اس طرح بروئے کار لایا کہ میلی ٹینٹس نے یونیورسٹی کے قیام کے لئے یہ علاقہ خالی کر دیا۔

مزید جب یونیورسٹی کا کام شروع ہوا تو اس وقت نہ اس مقام پر پانی تھا اور نہ بجلی تھی ۔ سڑک کا کہیں نام ونشان نہیں تھا۔ لیکن یونیورسٹی کے قیام کے تئیں یہ مسعود چودھری کا جنون ہی تھا۔ انہوں نے اپنے ذاتی اثرو رسوخ اور حوصلہ مندی سے کام لیتے ہوئے پانی اور بجلی کا انتظام تو کیا ہی رسائی کے لئے پہاڑوں کا سینہ چیر کر سڑک بھی بنائی۔ وہ علاقہ جہاں جانے کے خیال سے لوگ گھبراتے تھے یونیورسٹی کا شفاف ماحول بنایا بکثرت پیڑ پودے لگوائے اور جن کی بدولت یونیورسٹی کمپلکس مرکز علم و آگہی ہونے کے ساتھ ساتھ قابل نظارہ اور صحت افزا مقام مشہور ہو گیا۔ جسے مسعود چودھری کے معجزے کی تیسری اہم سطح کہا جا سکتا ہے۔

مسعود چودھری مدبر اور منتظم

از پروفیسر کفیل احمد قاسمی صدر شعبہ عربی مسلم علی گڑھ یونیورسٹی

جب بابا غلام شاہ بادشاہ یونیورسٹی ٹرسٹ نے جموں وکشمیر وقف کونسل کے زیر نگرانی ایک یونیورسٹی کے قیام کی تجویز رکھی۔ اور ۲۰۰۴ء میں اس یونیورسٹی کا قیام عمل میں آیا تو اس یونیورسٹی کی قیادت ایک ایسے شخص کے ہاتھوں میں آئی جو نہ صرف علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا فیض یافتہ تھا بلکہ صالحہ روایات کا امین اور قابل تقلید اسوہ بھی تھا۔ اس کی شخصیت ایک ایسے مخلص اور تجربے کار مالی کی سی تھی جو اپنے چمن مین شجر کاری اور اسکے پودوں کی تراش وخراش اور دیکھ بھال سے کبھی غافل نہ ہوا۔ یہاں میری

مراد مسعود احمد چودھری کی شخصیت سے ہے۔ جو اس یونیورسٹی کے پہلے وائیس چانسلر بنائے گئے۔ اور کارکردگی کی بنا پر انہیں اس عہدہ پر مزید ایک مدت کے لئے متعین کیا گیا۔ موصوف نے اس منصب سے پہلے بھی کئی عہدوں پر بے داغ خدمات انجام دیں۔ مزید انکے امتیازات کو اس یونیورسٹی کی تعمیر و ترقی میں اہم کردار رہا ہے۔ اور دانش گاہ کے چپہ چپہ پر انہوں نے اپنے نقوش چھوڑے ہیں۔

راہ کے نقش مسافر کا پتہ دیتے ہیں
کون کس شان سے گذرا ہے بتا دیتے ہیں

ڈاکٹر شمس کمال انجم

چھوٹی یا بڑی یونیورسٹی کی نقشہ سازی کرنا۔ اسے حقیقت کا پیکر دیا ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہیں ہوتی۔ دراصل مسعود چوہدری پہلے ہی سے انتظامی تجربات سے لیس تھے۔ جس کا ثبوت گرجر ٹرسٹ اسکے ساتھ چلنے والے اسکول اور ادھم پور کی پولیس اکیڈمی کی تاسیس و ترسیخ ہے۔ ان دو تین اداروں کو آپ نے صفر سے شروع کیا اور آج انکے ثمرات سے دنیا مستفید ہو رہی ہے بعینہ آپ نے بابا غلام شاہ بادشاہ یونیورسٹی کو بھی شروع کیا۔ امر واقعہ یہ ہے جس وقت آپ کو یونیورسٹی بنانے کا پروانہ عطا کیا۔ یونیورستی کے موجودہ محل وقوع پر عمارتوں کے ڈھانچے سڑکیں بجلی پانی کچھ بھی نہیں تھا۔ بارہا آپ پیدل چل کر یہاں پہنچتے تھے۔ اساتذہ کا تقرر تو کیا مگر وقتی مصلحت کے تحت کچھ عرصہ انہیں سیٹی میں ائر کنڈیشنڈ کمروں میں ٹھہرایا گیا۔ دسمبر

۲۰۰۴ء سے اگست ۲۰۰۵ء تک مختصر سا عرصہ مسعود صاحب کی صلاحیتوں کا امتحان لے رہا تھا۔ حسب وعدہ وقت مقررہ پر پہلا لیکچر آپ ہی نے دیا۔

آج یونیورسٹی کے پاس کیمپس ہے بجلی ہے پانی ہے بیشمار عمارتیں گل ولالہ کی طرح آراستہ ہیں۔ مشرق مغرب یک نظر میں، یک کلک میں ایسا خوبصورت منظر کہ آنکھوں کو یقین ہی نہیں آتا کہ یہ وہی جگہ ہے۔ جہاں چٹیل پہاڑیاں سینہ تانے کھڑی تھیں کشادہ عمارتیں، درس گاہیں اس طرح بتدریج اونچی ہوتی ہوئی قطاروں میں تعمیر کی گئی ہیں جو اس کے حسن و جمال میں اضافہ کرتی ہیں۔ صبح کو جب آفتاب مشرق کی پہاڑیوں کی اوٹ سے جھانکتا ہے۔ تو یونیورسٹی کے کم پلکس کا نصف حصہ اسکی زرتار کرنوں میں نہا جاتا ہے اور نصف آخر پر جیسے اس کے سائے کا شامیانہ نصب کر دیا گیا ہو۔ اسی طرح شام کو جب سورج اپنی شفق اس یونیورسٹی کے دامن پر بکھیرتا ہے محسوس ہوتا ہے وہ روزانہ لوگوں کو یہ احساس دلانا چاہتا ہے کہ اس علمی مرکز کے حسن و جمال پر میں بھی فدا ہوں،، میں سمجھتا ہوں کہ آج جس شکل میں اس یونیورسٹی کی تصویر ہمارے سامنے آتی ہے۔ مسعود صاحب نے اس کی مکمل تصویر ضرور بالضرور خواب میں اسی وقت دیکھ لی ہوگی۔ جب انہوں نے اسکی تعمیر و تاسیس کا بیڑا اٹھایا تھا ۔ورنہ اسے اس طرح جود کا جامہ پہنانا اس قدر خوبصورت انداز میں عمارتون کو اراستہ کرنا ممکن نہیں تھا۔

خالد حسین

وائس چانسلر مسعود احمد چوہدری نے جنگل میں منگل کر دیا ہے

غلام نبی آزاد وزیر اعلے ریاست جموں وکشمیر

مسعود احمد چوہدری کی انتھک لگن کا نتیجہ ہے جو انہوں نے اپنی پچاس سالہ تعلیمی انتظامی فلاحی کوششوں سے خصوصاً گوجر بکروال قبیلہ کو پسماندگی غربت اور افلاس کے دلدل سے باہر نکالنے اور انہیں زیور تعلیم سے آراستہ کرنے کے لئے انجام دئے ہیں۔ اپنے قبیلے یا طبقے کی بہبود کے لئے کئی لوگوں نے سوچا ہوگا لیکن اس سوچ کو عملی جامہ پہنانے کا سہرا صرف مسعود چوہدری کے سر جاتا ہے۔

ملکی تقسیم کے وقت خونی سیلاب میں جو لوگ بچ گئے اور غربت کی سطح سے نیچے زندگی گزار رہے ان میں سے اکثر لوگوں کی فلاح وبہبود کے لئے۔ چوہدری مسعود نے ایک تنظیم بنانا چاہی جس کے لئے مرالیاں تحصیل آر ایس پورہ کے چوہدری تاج الدین نے پانچ ہزار روپیہ چندہ بھی دیا۔ لیکن تنظیم کو جود میں لانے کی کسی نے دلچسپی نہیں دکھائی۔ کیونکہ لوگوں کو روٹی کپڑا اور سر چھپانے جیسی بنیادی ضرورتوں کے لالے پڑے ہوئے تھے۔ چنانچہ مسعود احمد چوہدری نے پانچ ہزار روپے کی رقم چوہدری تاج دین کو واپس لوٹا دی۔ لیکن مسعود احمد چویدری نے ہمت نہیں ہاری۔ انہوں نے چند اعلی تعلیم یافتہ دوستوں کو ساتھ ملایا اور جموں مسلم ایجوکیشنل سوسائٹی کا قیام عمل میں لایا گیا اس سوسائٹی کی گورننگ باڈی میں مشہور ماہر تعلیم سابق ڈائریکٹر ایجوکیشن غلام رسول آزاد تھے۔ ان کے علاوہ پروفیسر عبدالعزیز ،ڈاکٹر ظہور الدین، پروفیسر محمد یاسین بیگ اشتیاق حسین کاظمی، ایڈوکیٹ محمد اسلم گونی غلام احمد خواجہ سجاد چوہدری اور مسعود چوہدری اور جموں مسلم فیڈریشن کے صدر عبدالمجید بھی پیش پیش تھے۔ جو

آگے چل کر دانشکدہ ہائر سیکنڈری سکول بن گیا۔اس وقت مسعود چوہدری سپر انٹنڈنٹ پولیس تھے۔ وہ قوم کے پسماندہ طبقوں کی بہبود خصوصاً گوجر بکروالوں کو سماج میں جائز مقام دلانے نیز تعلیم یافتہ بنا کر تعلیمی نوکریوں میں انکی تعیناتی اور اس قبیلہ کو مرکزی سرکار کی طرف سے درجہ فہرست قبیلوں میں شامل کروانے کا خواب انہوں نے اپنی طالب علمی کے زمانے یں دیکھا تھا جس کی تعبیر کے لئے وہ صدق دلی اور سنجیدگی سے کام کر رہے تھے۔

انہوں نے چھنی جموں کے مقام پر گوجر دیس چیرٹ ایبل ٹرسٹ بنایا۔ دنیا گواہ ہے کہ یہ ٹرسٹ ۱۹۹۲ء میں بنا اور رجسٹرڈ کرایا گیا۔۔چندہ کر کے اکٹھے کئے گئے روپے سے دو کنال زمین خریدی گئی پھر مزید ۲۰ کنال ملحقہ اراضی پٹے پر لی الاٹ کروائی گئی۔ یہاں ایک اسکول کھولا گیا۔ جس کا نام مشہور فوجی جرنیل جو اپنے وقت کے ریاستی افواج کے سربراہ تھے۔ بریگیڈئر خدا بخش کے نام پر رکھا گیا۔کے بی اسکول کے نام سے مشہور ہے۔اس کمپلکس میں ایک سو طالبات کے لئے ایک ہاسٹل بھی بنایا گیا ہے۔ جہاں قیام و طعام اور لائبریری کی سہولتیں بھی فراہم کی گئی ہیں۔ ملک قوم اور ریاست کے لئے ان کی خدمات کو سراہا گیا۔

مسعود چوہدری نے اپنے اثر ورسوخ لڑا کر دو کروڑ روپے کی مالیت سے گرجر سینٹر فار کلچر اینڈ ہیریٹیج کی شاندار عمارت بنوائی۔اس عمارت میں ایک عمدہ لائبریری اور ریسرچ سینٹر کا قیام عمل میں لایا گیا۔اس تاریخی ریسرچ سینٹر کی عمارت کا افتتاح انیتس مئی ۲۰۱۰ء کو محترمہ سونیا گاندھی کے ہاتھوں ہوا اس تقریب میں سارے ملک

سے گوجر برادری کے لوگ بشمول ہندو مسلم سکھ شریک ہوئے اور مسعود چوہدری کے خواب کو شرمندہ تعبیر ہوتے دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔

ایسی شخصیت پر ملک و قوم کا فخر کرنا نہ فقط انکی عزت افزائی ہے۔بلکہ ان کی خدمات کا اعتراف بھی ہے وہ اپنے دور کے سرسید ہیں جبھی تو انہیں سرسید ثانی کہتا ہوں۔ جنہوں نے ایک پسماندہ طبقے کی تعلیم و ترقی کا بیڑا پار لگانے کی سعی سدید کی۔

ڈاکٹر جاوید راہی

گرجر چیرٹ ایبل ٹرسٹ

۱۹۹۲ء میں مسعود صاحب نے گرجر چیرٹ ایبل ٹرسٹ کی بنیاد ڈالی اس کام کی تکمیل اگر چہ وہ تنِ تنہا بھی کر سکتے تھے۔ لیکن انہوں نے اپنے ساتھ نوجوانوں کی ایک ٹیم بھی تیار کی۔ جن میں سے زیادہ تر کا تعلق جموں ضلع سے تھا۔اس ٹیم میں گوجروں کے نام پر کٹ مرنے والے تو بہت تھے۔ مگر خال خال ہی کوئی ایسا تھا کہ جس کا تعلق ثقافت ادب معیشت تعلیم و تدریس یا سماجی بہبود سے رہا ہو۔ ان نوجوانوں میں صرف جذبہ ہی جذبہ تھا اور کچھ کر گزرنے کی للک تھی۔ اس قافلے میں سب سے بڑے ہنر مند مسعود چوہدری ہی تھے۔ وہی ٹرست کے سپہ سالار تھے اور روح رواں بھی۔ اسی دور میں مسعود چوہدری نے نے بریگیڈئر خدا بخش میموریل اسکول کی بنیاد رکھی۔ مسعود چوہدری کا کمال تھا کہ انہوں نے "سرتھن اسکیم" کے گائڈ میں دی گئی بہت سی فارمیلٹیاں پوری کر کے حکومت ہند کے محکمہ ثقافت سے کلچرل ثقافت سینٹر بنانے کی غرض سے دو کروڑ روپیہ کی خطیر رقم منظور کروائی۔ یہ کام دراصل جوئے شیر لانے کے

مترادف تھا۔ ظاہر ہے اسی اسکیم کی عمل آوری کے نتیجے میں ایک باوقار عمارت تعمیر ہو پائی ہے۔ جسے اج گرجر سینٹر فار کلچرل ہیریٹیج کے نام سے جانا جاتا ہے۔ اس میں ایک آڈی ٹورریم اور ایک ریسرچ لائیبریری ہے۔ بیس ہزار کتابوں کے نادر نسخے مہیا کئے گئے ہیں۔ اب اس کلچرل سینٹر کو شادیوں کے لئے بھی کھول دینے کا منصوبہ زیر غور ہے۔

ٹرسٹ بننے کا میں عینی گواہ ہوں۔ مسعود چوہدری نے کس جانفشانی سے جموں کی اس بنجر زمیں میں اتنی بڑی بارونق عمارت بنوائی۔ تعلیمی اداروں کی داغ بیل ڈالی وہ دن دور نہیں یہ ثقافتی مرکز اقلیتی ایکٹ کے تحت ایک یونیورسٹی میں بدل جائے گا۔

اس ٹرسٹ کی بلڈنگ کا کام اس مہارت اور خوبصورتی سے ہوا ہے کہ جموں وکشمیر میں کسی بھی این.جی او کے پاس اتنابڑا عماراتی ڈھانچہ نہیں ہے۔

ٹرسٹ کا ایک اور بڑا کام گرجر تہزیب وتمدن پر کتابوں کی اشاعت ہے۔ اس سلسلے میں چوہدری صاحب نے گوجرون کی لوک وراثت لوک گیتوں کو تحریری طور پر سنبھالنے کا کام مجھے سونپا۔ کافی محنت کے بعد میں نے ٹرسٹ کو تین کتابین تیار کر کے دیں۔ ان میں اردو میں لکھی گئی کتاب " گرجر شناخت کا سفر" گوجری میں "لوک ورثو" اور " گوجری لوک گیت" شامل ہیں۔

سال ۱۹۹۵-۹۶ے دوران مسعود صاحب چاہتے تھے کہ سرینگر میں گرجر دیش چیرٹ ایبل ٹرسٹ کی ایک شاخ قائم ہو۔ اس سلسلے میں سرینگر میں غلام رسول بڑھانہ، چوہدری منظور آئی ایف ایس، سلام دین آئی بی ایس اور گلاب دین طاہر سے

گھنٹوں بات چیت ہوتی رہتی تھی۔ لیکن کشمیر کے گوجروں نے اس سلسلہ میں کوئی خاص گرم جوشی نہیں دکھائی۔ وگرنہ ٹرسٹ کا ایک دفتر وہاں بھی قائم ہوچکا ہوتا۔ ان ہی دنوں چوہدری مسعود نے آوزِ گرجر نامی رسالے کی رسم رونمائی بھی کی۔ یہ دیدہ زیب رسالہ کئی سال تک شائع ہوتا رہا۔ مزید ایک ایسا مشن کا آغاز ہوا جس کے ذریعے گوجری زبان کا تحفظ ممکن ہو پایا۔

مسعود چوہدری ہر کام مین ڈسپلن کا خاص خیال رکھتے ہیں۔ وہ کسی بھی تقریب کا اہتمام کرتے وقت سوئی دھاگے قینچی تک کی خود جانکاری رکھتے ہیں کہ وہ کس کے پاس ہوگی اس لئے انکی طرف سے منعقدہ کی گئی تقریبات میں کسی بھی طرح کی بے ترتیبی کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔

سال ۱۹۹۷ء میں سرینگر ریڈیو آڈیٹوریم میں منعقدہ ایک گوجری مشاعرے میں انہیں مہمان خصوصی کے طور پر مدعو کیا گیا تھا۔ تقریب کے دوسرے دن جب میں نے مشاعرے کی داد چاہی تو انہوں نے کچھ شاعروں کے حلئے اور کپڑوں پر طنز کرتے ہوئے کہا کہ ان شاعروں کو کہا کرو کہ اپنے ڈریس کوڈ کا دھیان رکھا کریں اور کم از کم مشاعرے میں آنے سے پہلے اپنے بال تو کٹوالیا کریں۔ گلے شکووں ذاتی رنجشوں اور تلخیوں کا ذکر ایک طرف رکھتے ہوئے۔

آپ نے مسعود صاحب کی جوانی کی تصویر دیکھی ہے جس میں وہ دلیپ کمار جیسے لگتے ہیں۔ کیا پتہ ہے انکی بھی کوئی مدھوبالا ہوئی ہو معلوم نہیں مگر انہوں نے رومانی تصور میں زندگی نہیں گنوائی بلکہ اسے ہمہ گیر جدوجہد میں خرچ کیا ہے۔ مانا انہوں نے

مجنوں کی طرح کسی لیلی کے لئے دشت نوردی نہیں کی لیکن یہ کیا کم ہے انہوں نے جموں کے تپتے ہوئے صحراوں میں ننگے پاوں چلتے والے اپنے قبیلے کے راستوں سے کانٹے ضرور چنے ہیں۔

مانا انہوں نے کسی شیریں کے لئے کوہ بیستون کا سینہ چیر کا دودھ کی نہر تو نہیں نکالی لیکن یہ کیا کم ہے کہ انہوں نے خطہ ء پیر پنجال کے پتھروں کے سینے سے علم و ہنر کے چشمے رواں کئے ہیں چاہے۔وہ گرجر چیرٹ ایبل ٹرسٹ کے قیام کا مدعا ہو یا بابا غلام شاہ بادشاہ یونیورسٹی کا قیام۔ تا قیامت علم و ہنر تلاش کرنے والوں کی پیاس بجھاتے رہیں گے۔

مسعود احمد چودھری یوں تو کہتے ہیں کہ وہ سیاست کے بازار تخت و بخت سے ہر طرح لاتعلق ہیں۔ میں سیاست دان نہین بننا چاہتا سیاست کے لئے میرے پاس کوئی جگہ نہیں، مگر میں نے اپنے مشاہدے میں پایا ہے کہ سیاست سے باہر رہنے کے باوجود چوہدری صاحب اس سمندر کی طلاطم خیزیوں اور مد و جزر سے گہرا شغف رکھتے ہیں۔ الیکشن کے دنوں مین ان کے گھر کے آس پاس سیاسی لیڈروں کی کافی بھیڑ جمی رہتی ہے اور کئی امیدوار انکا آشیرواد لینے آتے رہتے ہیں کیونکہ وہ گوجروں کے ایک بڑے طبقے میں اپنا خوب اثر ورسوخ اور پکڑ رکھتے ہیں یہی سبب ہے کہ ہر پارٹی ان کے ساتھ رابطے میں رہتی ہے اس کے باوصف کی ان کا برادرِ اصغر چودھری جاوید احمد رانا نیشنل کانفرنس سے وابسطہ اور ممبر قانون ساز بھی ہیں۔

میں نے یہ بھی دیکھا ہے کہ وہ ایک بڑے پلانر کی طرح ہر بات یا کام کے لئے لمبی پلاننگ کرتے ہیں اور ہر منصوبے میں وہ وقت کے ساتھ الگ الگ رنگ بھرتے رہتے ہیں اور کبھی کبھار تو منصوبوں کا پورا خاکہ ہی بدل دیتے ہیں۔

میں نے یہ بھی دیکھا ہے کہ انکا زیادہ تر زور چیزوں کی ظاہری آراستگی اور ہر کام کی پبلیسیٹی پر توجہہ دیتے ہیں تا کہ خاص و عام ان کی طرف سے کئے جانے والے کاموں سے واقفیت حاصل کر سکیں۔بعض کاموں کے بارہ میں وہ لوگوں کو خود ہی تفصیلی اطلاع دیتے رہتے ہیں ۔

میں نے یہ بھی دیکھا ہے کہ (مدیریت و تدارکات کے اصولوں کے تحت)چوہدری مسعود ہر معاملے میں متبادل تلاش کرتے رہتے ہیں۔وہ چیزوں کی بہت سی جہتیں تلاش کرتے رہتے ہیں اور ہمیشہ نقشہ بنا کر کام کرتے ہیں وہ ہر کام کے منفی و مثبت پہلووں پر خوب غور کرتے ہیں۔مجھے معلوم ہے کہ وہ شطرنج نہیں کھیلتے لیکن میں نے دیکھا ہے کہ انہوں نے کئی پیادوں اور وزیروں کو گرا کر کے کو ان کے اوقات یاد دلائے ہیں۔

ڈاکٹر بشارت حسین انقلابی

برسوں لگی رہی ہیں جب مہر و مہ کی آنکھیں
تب کوئی ہم سا صاحب، صاحب نظر بنے ہے
یاران دیر و کعبہ دونوں بلا رہے ہیں
اب دیکھیں میر اپنا جانا کدھر بنے ہے

یوں تو مسعود چودھری سے میری شناسائی زائد از دو عشروں سے ہے لیکن قریب سے جاننے کا موقع یونیورسٹی میں ۲۰۰۴ تا ۲۰۰۶ بطور اسٹنٹ رجسٹرار تعیناتی کے دوران ملا۔ یونیورسٹیاں کیسے بنتی ہیں یہ راز مجھے اس وقت سمجھ آیا جب مسعود چودھری کی سر پرستی میں ہم پہلی میٹنگ کے دوران دھنور کی خودرو جھاڑیوں کے درمیان ، گرمی سردی سے سڑے ہوئے پتھروں پر بیٹھے۔ ہمارے سامنے مسعود چودھری نے یونیورسٹی کا خاکہ بنایا۔ وقت کا پہیہ جوں جوں آگے چلتا گیا یونیورسٹی کے خط و خال انکی سوچ سے ہم آہنگ ہو ہو کر زمینی سطح سے اوپر اٹھ کر سامنے آتے گئے۔

کبھی کبھی میں سوچتا ہوں کہ یہ شخص بیک وقت ایک لیڈر، ایک ماہر تعلیم او ایک بڑا منصوبہ ساز بھی ہے!!!!

ایک ہی شخص میں کئی خوبیاں حیرت انگیز طور پر جمع ہو گئی ہیں۔

ویسے تو شروع شروع میں دھنور کے مقام پر ایک فیڈنگ اسکول کے قیام و تشکیل کا منصوبہ تھا لیکن مسعود چودھری نے اختلاف کیا اور وزیر اعظم مفتی سعید کو رضامند کر کے ایک یونیورسٹی بنانے کی منظوری لے لی۔ اس تجویز کی تائید میں وزیر اعلے کے معتمد خاص نعیم اختر اندرابی نے مثبت رول ادا کیا۔ مسعود چودھری نے اپنی عملی تدابیر سے ریکارڈ ٹائم میں یونیورسٹی کی سینکشن حاصل کر لی۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس کٹ آف علاقے میں سڑک بنوالی۔ پھر پانی اور بجلی بھی دستیاب کروالی۔ یونیورسٹی کا کانسٹی ٹیوشن بنایا اور جغرافیائی حقائق کو مد نظر رکھتے ہوئے پونچھ راجوری کے طلباء و طلبات لئے ۲۵ فیصد ریزرویشن مقرر کر دی جو کہ اس خطہ پر ایک احسان ہے۔ مزید

بے آب و گیاہ مقام پر یونیورسٹی کا قیام کر کے ماہرین تعلیم کی آمد کے سلسلہ کو یقینی بنایا۔ ایک بیابان کو علمی ہنگاموں کا شہر بنادیا ۔ آج یونیورسٹی کی عمارتوں کے سلسلے اور چہل پہل کا بازار انکی بصیرت اور وژن کی گواہی دے رہے ہیں۔

تیشے سے بجاتا میں پھروں بربطِ کہسار
نغمے جو مرے دل میں ہیں پتھر سے نکالوں

جناب اسلم قریشی

مسعود صاحب ایک توانا کردار ہے ۔ انکی شخصیت کی کئی تہیں یا پرتیں ہیں جنہیں ہر کوئی آسانی سے نہیں پڑھ سکتا ہے۔ بہر حال ان کے وجود میں نئے جزیرے تلاشنے کی ضرورت ہے۔

وہ جس منصب پر بھی رہے اس منصب کو ان کی کارکردگی سے وقار ملا۔ اگر یہ کہا جائے تو کوئی مبالغہ نہ ہوگا۔ انکی ذات سے منصب فروزاں ہوتا رہا نہ کہ انکی ذات اس منصب سے درخشاں رہی ۔ بے شک وہ اپنے نمایاں کارناموں کی بنیاد پر بے مثال و بے نظیر ہیں۔

دو کارنامے ایسے ہیں جن کی وجہہ سے وہ ہمیشہ یاد رکھے جائیں گے۔ ایک تو بابا غلام شاہ بادشاہ یونیورسیٹی کے تئیں انکا مجاہدانہ رول اور دوسرا گوجر کلچرل سینٹر کا قیام۔ یہ مفتی سعید صاحب کی چیف منسٹری کا دور تھا کہ جب انہیں علم ہوا کہ ریاست میں مسلم قوم اپنے تنزل کی طرف بڑی تیزی سے رواں دواں ہے۔ جس پر قدغن لگانا انکی اخلاقی ذمہ داری تھی تو انہوں نے مسلم او قاف کا پیسہ مسلم قوم کے نوجوانوں کی از سرِ نو

کردار سازی پر خرچ کرنا وقت کی ضرورت سمجھا اور بابا غلام شاہ بادشاہ یونیورسٹی کا قیام عمل میں لایا اور اغراض و مقاصد کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ایک فعال اور متحرک شخص یعنی مسعود چوہدری کو اس یونیورسٹی کا بنیاد گزار وائس چانسلر منتخب کیا۔ مفتی سعید کی دانش و بینش بے مثال ثابت ہوئی،

مسعود چوہدری کوئی پروفیسر تھے ۔نہ شاعر نہ ادیب نہ حکیم البتہ وہ انسانی زندگی سے متعلق گہرا مشاہدہ رکھتے تھے ۔طویل تجربے ہی سے انکی شخصیت کی تزئین ہوئی ۔انہوں نے بہت عزت و شہرت پائی۔ اگر چہ انکا پیشہ درس و تدریس نہیں رہا ۔مگر یہ کیا کم تھا کہ اسلامی تہذیب و تمدن کی بازیافتگی کی خاطر قائم کی گئی یونیورسسٹی کے وہ پہلے وائس چانسلر اور سربراہ مقرر ہوئے۔

بہر حال مسعود چوہدری کے بطور وائس چانسلر بننے کے در پردہ پتہ نہیں کتنے اور کیسے ہی محرکات اور وجوہات کار فرما ہوں، انکی سیلکشن کو ہر طبقہ ءخیال کے لوگوں نے سراہا۔ اور فالِ نیک تصور کیا۔ اور ہوا بھی یہ کہ مسعود صاحب نے اپنا تمام آرام و آرائش کو تج کر کے، وہ تمام ابتدائی دقتیں دور کر دیں جو کہ یونیورسٹی کے قیام میں سد راہ تھیں۔ فقط آٹھ مہینے کے ریکارڈ ٹائم میں انہوں نے یونیورسٹی کو اسکے "ٹیک آف سٹیج "پر کھڑا کر دیا۔ مسعود چوہدری اس تفویض کردہ رول کی سر انجام دہی میں ایسے تازہ دم ثابت ہوئے کہ جسکی کبھی امید نہیں کی جاسکتی تھی اور وہ نتائج دیے جو خیرہ کرنے والے تھے۔ انکی یہ خواہش رہی کہ اگر یونیورسٹی کے ماحول میں بھی طالب علموں کی سوئی اور چھپی ہوئی صلاحیتیں اور قوتیں نہ جاگیں تو اور کہاں جاگیں گی؟۔ یہی تو وہ

ماحول ہے جہاں انسانانی اوصاف نکھر کر سامنے آتے ہیں اور ہر طالب علم کا اخلاقی شناس نامہ ترتیب پاتا ہے۔

بس کلائی تھامنے کی دیر تھی پھریوں ہوا
میرے سارے جسم پر وہ نبض طاری ہوگئی

مسعود چوہدری کی زندگی کا دوسرا بابِ امتیاز جیسا کہ اوپر کہا بھی گیا ہے "گجر کلچرل کلچرل سینٹر ہے۔ اسکے در پردہ بزرگوں کی میراث کو بچا رکھنے کا جنوں کوئی عجیب حکایت نہیں ۔یہ ورثہ علمی اور دیگر انواع کے نوادرات سے قطعِ نظر ان قدروں اور روایتوں سے عبارت ہے جو قوم کو سینہ بہ سینہ منتقل ہوئی ہیں۔ بنگال ایشیاٹیک سوسائیٹی کے موجد سر ولیم جونز کی طرح طرح گوجر تہذیب و تمدن کے آثار کو محفوظ کرنے کا خیال مسعود چودھری کے علاوہ کسی کو نہیں آیا۔ اس کارنامے کے سبب وہ زندہ رہیں گے۔ یہ کلچرل سنٹر اس وقت معرض وجود میں آیا ہے۔ جب کہ ہماری تدریسی اور ثقافتی وراثت کو جتنا خطرہ آج لاحق ہے اتنا کبھی پہلے نہیں تھا۔

جس یونیورسٹی کے قیام اور تشکیل کے سلسلہ میں انہوں نے اپنا خون پسینہ بہایا۔ اپنے آرام و آسائش کو بالائے طاق رکھا۔ جس یونیورسٹی کی باقاعدہ شروعات کو یقینی بنانے میں انہوں نے بڑی مستعدی اور سرعت سے کام کیا۔ اس بابا غلام شاہ بادشاہ یونیورسٹی نے انہیں ڈی لٹ کی ڈگری کی دی۔

چوہدری علی حسین ہکلا

ٹرسٹ کے قیام کا تصور کلی فقط اور فقط مسعود چودھری نے دیا۔ ۱۹۹۰ء سے پہلے کی بات ہے کہ ان کی سربراہی میں مقامی گرجر ملازمین کی میٹنگ بلائی گئی جس میں ماسٹر ہاشم علی، علی حسین ہکلا، محمد شریف، اللہ رحیم، محمد حنیف، اللہ دتا، نذیر احمد، بشیر احمد نون اور یوسف کھیپڑ نے شمولیت کی اور فورا ملازمین کی ایک انجمن بنائی گئی۔ان دنوں چودھری صاحب وبیجی لنس میں تھے۔ اسکے بعد جموں کے مقامی گرجروں کو بھی دعوت دی گئی اور جموں ریزی ڈنسی روڈ پر بمقام عید گاہ میٹنگ میں حصہ لینے والوں میں مذکورہ بالا ملازمین کے علاوہ بشیر احمد جج، چودھری علاء الدین سپرٹنڈنگ انجیئر ،احسان اللہ اکاونٹ آفیسر کے علاوہ شوکت جاوید، شوکت پرویز فاروق عالم، سجاد مجید وغیرہ سرکردہ اشخاص میں سے بنیادی چودہ ممبران ٹرسٹ نے فی کس دس ہزار روپیہ چندہ دیا۔ اور اس طرح جمع کی گئی رقم سے گوجر کلونی بائی پاس یعنی ٹرسٹ کے موجودہ احاطہ میں واقع پلاٹ نمبر ۴۸ کو خرید لیا گیا۔اس میں بنے ہوئے ایک کمرہ کو ٹرسٹ کا دفتر بنایا گیا۔ شروعات میں موجودہ ٹرسٹی شوکت پرویز نے پچاس ہزار اینٹیں (جو اس وقت ڈیڑھ لاکھ روپے قیمت کی تھیں) فراہم کیں۔بنیاد اٹھانے کا وقت کا وقت آیا تو سیمنٹ نہیں تھی مسعود احمد چودھری نے پچھتر ہزار روپے چندہ دیا پھر کیا تھا ایک سلسلہ ہو گیا۔ بلا امتیاز مذہب وملت جموں کے مقامی لوگوں نے دل کھول کر مالی معاونت کی۔بعد ازاں مولانا آزاز فانڈیشن نے

گرلز ہوسٹل کے لئے پچیس لاکھ روپے فراہم کئے۔ اسی طرح مرکزی محکمہ کلچرل نے ایڈیٹوریم و ثقافت سینٹر کے دو کروڑ روپے کے پراجیکٹ منظور کیا اور اڑسٹھ

لاکھ روپیہ واگزار کر دیا۔ وزراء کرام اور سیاست دانوں نے بھی اپنے فنڈ کی تھیلی کا منہ کھول دیا۔ غلام نبی آزاد نے پچاس لاکھ روپے دے کر اپنا نام سرفہرست لکھوایا۔ ڈاکٹر فاروق عبداللہ نے تیس لاکھ اور عمر عبداللہ نے بیس لاکھ روپے دئے۔لائبریری اور ثقافتی سینٹر میں چندے کی تفصیلات موجود ہیں۔ الغرض مخیر ان کے تعاون ہی سے کرتے کراتے یہ عمارتوں کا وسیع سلسلہ جو تقریباً ڈھائی ایکڑ اراضی پر پھیلا ہے پایہء تکمیل کو پہنچا ہے۔

ہمارے ٹرسٹ کا ذریعہ آمدنی عطیات کے علاوہ کرایہ کی رقم بھی ہے لائبریری ہال اور ایڈیٹوریم جس میں ایک ہزار کرسیاں / نشستیں ہیں جو آمدنی کا معقول ذریعہ ہے۔ مجموعی طور پر ہمارا یہ ٹرسٹ 'بغیر کسی نفع یا نقصان' کے کام کر رہا ہے۔اور ہم سبھی سماج سے ایک کٹے ہوئے انگ کا تسلی بخش علاج کر کے اسے اسکے دھڑ سے ملانے کے لئے کوشاں ہیں۔ ہماری کامیابی کا راز مسعود چودھری کی سربراہی ہے اور ہمارے ساتھیوں کا جزبہ خیر سگالی اور بے لوث خدمت کا جذبہ۔ پچھلے پچیس سالوں سے ہمارے ٹرسٹی ساتھی بغیر کسی لالچ، ناموری، تنخواہ، بونس یا وظیفہ کے اس عوامی فلاح کے اس غیر سرکاری ادارے میں انہماک کے ساتھ مشغول ہیں۔ جس کا مقصد اپنی ثقافت و تہذیب کو بچانے علم و ہنر کو فروغ دینا ہے اور پچھڑے ہوئے طبقے کی فلاح و بہبود ہے ہم امید کرتے ہیں کہ ہماری یہ کاوش اس قوم کی ہمایوں اقبالی کا ذریعہ ثابت ہو گی۔

میں اکیلا ہی چلا تھا جانب منزل مگر

لوگ ساتھ آتے گئے اور کارواں بنتا گیا

پروفیسر ڈاکٹر اے کے کول

دھنور کے نخلستان سے پہلے ہی مسعود چودھری کو جانتا تھا۔ ایک ایک ایسی جگہ جو پانی اور بجلی جیسی بنیادی سہولیات سے محروم تھی۔ یونیورسٹی بنانے کا سوچنا بھی محال تھا یہی وجہ ہے مدت قلیل میں یہاں یونیورسٹی کو عملی صورت میں دیکھنے والا انگشت بدنداں رہ جاتا ہے۔

پروفیسر دین محمد

وائیس چانسلر آتے ہیں اور جاتے ہیں لیکن ان میں سے کچھ ہی یونیورسٹی کی لوح پہ اپنا نام ہمیشہ کے لئے ثبت کرنے میں کامیاب ہوتے ہی مسعود چودھری زندہ دل و تیز فہم شخصیت کے مالک ادارہ سازوں کے لئے ایک روشن و تابندہ مثال ہیں اور آنے والے وائس چانسلروں کے لئے باعث رشک بھی۔

چودھری شوکت جاوید (ٹرسٹی)

پچھلے پچیس تیس سالوں میں کوئی ایسا دن یا تاریخ نہیں گزری کہ مسعود چودھری نے مجھے روازنہ چار بار فون نہ کیا ہو فون کرنے کا کوئی وقت مقرر نہیں تھا کبھی رات کے وقت کبھی سحری کو کبھی علی الصبح کبھی دوپہر کے وقت۔ وہ ہماری رہنمائی میں کمربستہ و مستعد رہے ہیں۔ ہم نے ٹرسٹ کے زیر انتظام کے بی اسکول میں غریبی کی سطح سے نیچے زندگی بسر کرنے والے کنبوں کے زائد از دوسو بچوں کو اسکول فیس معاف کر رکھی ہے۔ بلکہ انہیں کتابیں اور وردی بھی مفت دی جاتی ہے۔ ہمارے پاس اپنی دس

اسکول بسیں ہیں۔ ہم ڈے اسکالر بچوں سے برائے نام کرایہ لیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارا ٹرانسپورٹ کا نظام سالانہ دس لاکھ کے خسارے سے چلتا ہے اور ہم دیہاتی بچوں کو آمد و رفت کی سہولیات فراہم کر رہے ہیں۔ ہمارے سب ٹرسٹی مفت ہی بغیر کسی معاوضے یا وظیفے کے کام کر رہے ہیں۔ میرے خیال میں گرجر دیش چیرٹ ایبل ٹرسٹ کا یہ جزبہ مثالی ہے بلکہ اگر اگر مبالغہ نہ سمجھا جائے تو مسیحی مشنریوں سے دو ہاتھ آگے ہے۔

شوکت پرویز (ٹرسٹی):

ٹرسٹ کے قیام کے بعد ہمارے لوگ احساس کمتری سے نکل کر باہر آگئے ہیں۔ جہاں ایک طرف جدید تعلیم نے ہمارے نوجوانوں کو تعلیم کے ذریعے روزگار کے مواقع فراہم کئے ہیں وہاں مجموعی طور پر ہماری برادری کی عزت و قدر اور منزلت میں گرانقدر اضافہ بھی ہوا ہے۔

ڈاکٹر صابر آفاقی

ہر حسیں سے رہ چکی گویا ازل میں دوستی
ایسے ملتا ہے کہ جیسے ہو پرانا آشنا

قدرت نے مسعود چودھری میں کئی خوبیاں جمع کر دی ہیں۔ آپ خوش گفتار، باکردار، سلیقہ شعار اور ملت کے غم خوار ہیں۔ سماجی فلاح کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں جانتے ہیں کہ ترقی کا واحد ذریعہ تعلیم ہے اس مقصد کے حصول کے لئے دو وسیع قطعات زمیں حاصل کر کے ایک گوجر کمپ پلکس تعمیر کیا ہے اور دوسرے میں

نرسری تا کالج کا انتظام کیا ہے۔ ملازمین کی اکثریت میں پنڈت ہیں میرے استفسار پر چودھری صاحب نے یہ جواز پیش کیا کہ ایک تو ان پناہ گزینوں کی مدد کار ثواب ہے اور بڑی بات یہ کہ یہ لوگ بڑی محنت اور ذمہ داری سے کام کرتے ہیں۔ رانا علی حسن چوہان کے بعد چودھری مسعود دوسرا گوجر سکالر دیکھا ہے جو قبائل کی تاریخ پر اتنی گہری نظر رکھتا ہے۔ پھر اس پر دل نشین انداز گفتگو بھی۔

مسعود چودھری کہتے ہیں یونیورسٹی کو ایسے اساتذہ کی ضرورت ہے جو تدریس کو پیشے سے زیادہ جذبات کے ساتھ جوڑیں۔ جو کسی انعام کی خواہش سے زیادہ پہاڑوں کو ہلانے کے جزبہ سے سرشار ہوں۔ خواب وہ نہیں جو تم سوتے ہوئے دیکھتے ہو بلکہ خواب وہ ہے جو تمہیں سونے نہیں دیتا۔ (اے پی جے عبدالکلام)

تعلیم صلاحیتیں بناتی ہے اور لوگوں کو طاقت ور بھی۔ ترقی کے مواقع سے فائدہ نہ اٹھانا ہی غربت ہے۔ (امریتا سین)

کتابیات

مٹی کے صنم۔ کرشن چندر
کشمیر۔ چراغ حسن حسرت
ادبیات پونچھ۔ محمد ایوب شبنم
دھوپ چھاؤں۔ خالد نظامی
حیات نبی بخش نظامی۔ نبی بخش نظامی
روشن چراغ۔ موتی لعل کپور

عکس کشمیر و پرتو کشمیر: ڈاکٹر صابر آفاق
جموں و کشمیر کی جغرافیائی حقیقتیں۔ پروفیسر جی ایم میر
تہذیب الاخلاق۔ سرسید احمد خاں
آخری، مضامین۔ سرسید احمد خاں
سرسید اور انکے نامور رفقاء از سید عبداللہ
ڈاکٹر ذاکر حسین شخصیت و معمار
راس مسعود۔ حکیم سید ظل الرحمان
حیات جاوید۔ لطاف حسین حالی
تاریخ پونچھ۔ کے ڈی مینی
تاریخ راجوری۔ کے ڈی مینی
ڈاکٹر ذاکر حسین سیرت و شخصیت۔ عبداللطیف اعظمی
فتح محمد کریلوی: ایس محمود آزاد
داستان تاریخ اردو۔ حامد حسن قادری
سفر محبتوں کا۔ ڈاکٹر صابر آفاقی
گوجر منزل بہ منزل۔ مضامین محمد یوسف ٹینگ۔
کچھ تو لکھئے کہ لوگ کہتے ہیں۔ ڈاکٹر آغا اشرف علی
سوونیر: جی ڈی سی ٹی، چھنی جموں تمام اشاعتیں
آواز گورجر: جی ڈی سی ٹی چھنی جموں تمام اشاعتیں

بروشر: بی جی پی ایس بروشر تمام اشاعتیں

نیوز لیٹر: بی جی پی ایس بروشر تمام اشاعتیں

روڈمیپ: بی جی پی ایس یو دھنور راجوری

ویژن ڈاکیومنٹ: بی جی پی ایس یو دھنور راجوری

تمت